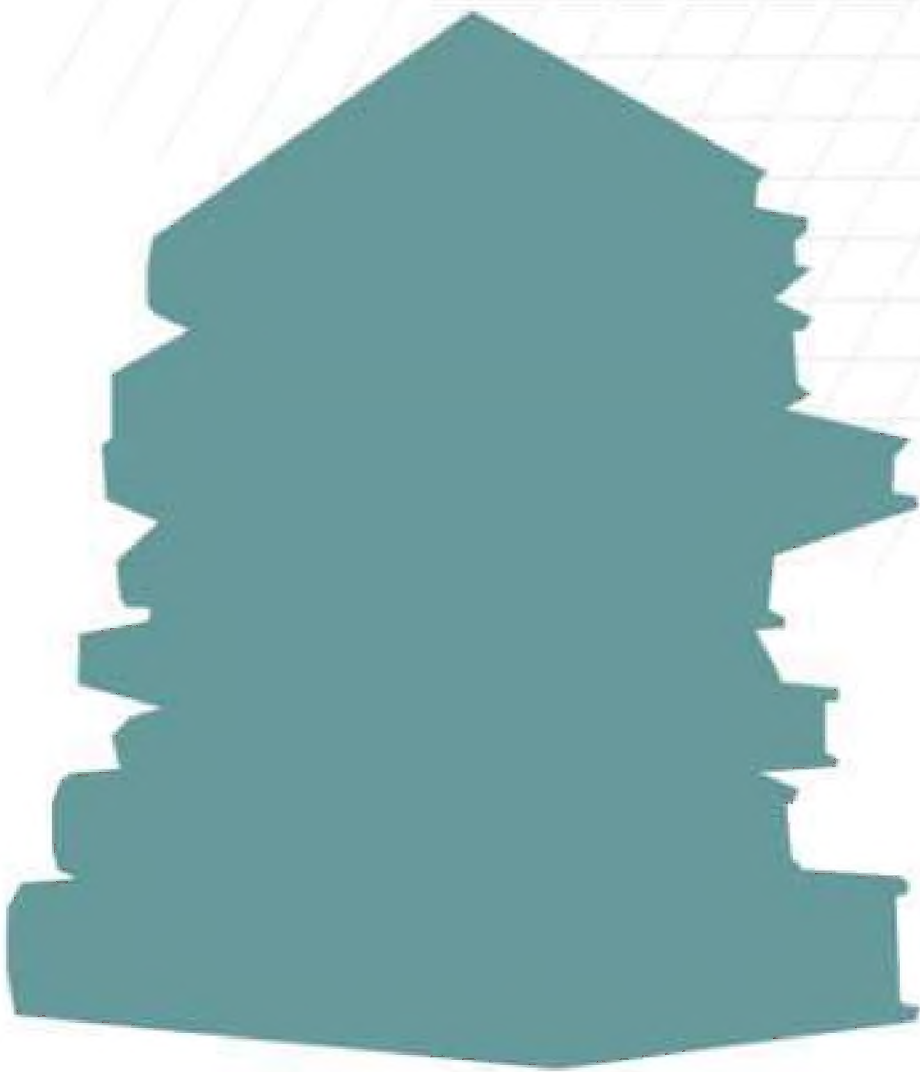
ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی

حضرت کمال رحمۃ اللہ علیہ

حیات اور شاعری



حضرت کمالؒ

حیات اور شاعری



از

ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی

مجلسِ مصنفین اِسلامی، گیا

بار اوّل : ۱۹۹۵ء
باہتمام : ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
ناظم مجلس مصنفینِ اسلامی
بیت الرشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا
کتابت : قمر نظامی، معروف گنج، گیا
طباعت :
صفحات : دو سو چالیس
قیمت : ۱۰۰ روپے Rs. 100/-
تعداد : پانچ سو

ملنے کے پتے :
(۱) ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی
بیت القاسم، ذاکر نگر، ڈاک خانہ آزاد نگر
جمشید پور — ۸۳۲۱۱۰
(بہار)
(۲) ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
بیت الرشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج،
گیا ۸۲۳۰۰۱
(بہار)

Produced by:—
TIPS Printing Services, New Delhi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہار کا ایک گُم نام مگر باکمال شاعر

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی رح

۱۱۳۰ھ — ۱۲۱۵ھ
۱۷۲۰ء — ۱۸۰۳ء

حیات اور شاعری

•

حصّہ اوّل : حیاتِ کمالؔ
حصّہ دوم : کمال شاعری
حصّہ سوم : کلامِ کمالؔ

•

از
ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی

ناشر
مجلس مصنفین اسلامی
"بیتُ الرشاد" شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا

اِنتساب

ایک صحابی نے سرورِ کائنات ؐ سے پوچھا : ادائیگی حقوق کے سلسلے میں پہلا حق دار کون ہے ؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اُمُّكَ (تیری ماں)

دوسری مرتبہ پوچھا ، دوبارہ فرمایا اُمُّكَ (تیری ماں)

تیسری بار پوچھا تو سہ بارہ فرمایا اُمُّكَ (تیری ماں)

چوتھی مرتبہ پوچھا تو فرمایا ' اَبُوْكَ (تیرا باپ)

اِس لئے میں اِس کتاب کا انتساب اپنے والدین کے نام کرتا ہوں جن کی آغوشِ محبت و شفقت میں ، میں پروان چڑھا ۔

اور

جن کی تعلیم و تربیت نے مجھے اِس لائق بنایا ۔

شاہ حسن عثمانی

فہرست مضامین

حرفِ اوّل

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ، عہدِ میرؔ کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے شاعرانہ کمالات پر کوئی تنقیدی مطالعہ آج تک پیش نہیں کیا گیا۔ دراصل جس طرح بہت سے شعراء جو شاعرانہ حیثیت سے قابلِ لحاظ ہو سکتے تھے، پردۂ خفا میں ہیں۔ اس طرح حضرت شاہ کمال علیؒ کمالؔ کو بھی شہرت حاصل نہیں ہو سکی۔ بعض پرانی کتابوں میں ان کا ذکر سرسری طور پر ملتا ہے۔ ایسے سرسری ذکر سے بھی مجھے احساس ہوا کہ ان کی حیثیت اپنے وقت میں انتہائی اہم رہی ہوگی۔ موصوف کا تعلق چونکہ ایک صوفی خاندان سے تھا، اس لئے صوفیانہ مسلک سے ان کی وابستگی فطری تھی، صوفیوں کا مسلک بھی اپنی تشہیر نہیں ہوتا شاید یہی وجہ ہے کہ شاعرانہ امتیازات کے باوجود انھوں نے اپنے وقت میں خود کو ممتاز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ افسوس ہے کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصّہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

مجھے حضرت کمالؔ سے ایک تعلق خاطر رہا ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ میرے والد محترم حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسیؒ نے "مناقب کمالیہ" مرتب کی تھی۔ اس کتاب میں حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کے احوال و آثار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کلام کا کچھ حصّہ نمونے کے طور پر درج بھی کیا گیا ہے۔ آج یہ کتاب حضرت کمالؒ کی خدمات اور کارنامے کا ایک اہم ماخذ ہے، چونکہ یہ کتاب ایک قلمی نسخے کی حیثیت میں میرے مطالعے میں رہی ہے اس لئے کبھی مجھے حضرت کمالؒ پر تفصیلی کام کرنے کا اشتیاق ہوا اور چونکہ میرا تعلق بھی اسی خانوادہ سے ہے اس لئے مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ متعلقہ موضوع میرے مزاج اور فکر کے عین مطابق ہے اور مجھے اس مشکل کام کو بہرحال سرانجام دینا چاہئے۔ لہٰذا میں نے سب سے پہلے حضرت کمالؒ کے کلام کی جستجو شروع کی۔

اِس سلسلے میں، مَیں اپنے بزرگ اور خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کے سجادہ نشیں عم مکرم

حضرت حکیم شاہ محمد ابراہیم صاحب فردوسیؒ کا بے حد شکرگزار ہوں، جن کی عنایت اور توجہ سے حضرت کمالؔ کا تمام غیر مطبوعہ اُردو کلام مجھے حاصل ہوا۔ جن کی ترتیب و تدوین ایک بڑا کام تھا۔ جو بحمد اللہ بڑی کاوش اور محنت سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جو کلامِ کمالؔ کے عنوان سے اِس کتاب کا تیسرا حصّہ ہے۔

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کے آثار و احوال نیز فنی کمالات کے جائزے ہی میں، مَیں نے مقدور بھر یہ کوشش کی ہے کہ تمام اہم نکات زیرِ بحث آجائیں اور سیاق و سباق کے حوالے سے ان کی شاعرانہ عظمت متعین ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اُن صوفیائے کرام پر بھی روشنی ڈالنی چاہی ہے جنھوں نے بہار میں اُردو زبان میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا اور اس زبان کے فروغ کا باعث بنے۔ اس باب میں مختلف صوفیانہ سلاسل کا ذکر ناگزیر ٹھہرا۔ پھر ان خانقاہوں کا بھی جہاں سے روحانی فیض و برکات کا چشمہ پھوٹتا رہا ہے اور جن کی عقبی زمین میں شعر و ادب کے پھول کِھلتے رہے ہیں۔ میری کوشش رہی ہے کہ کھری اور بامعنی تحقیق کے جو مطالبے رہے ہیں وہ ہر حال میں پورے ہوں۔ اس لئے میں نے واقعات کے چھان پھٹک میں داخلیت اور جذباتیت کو راہ نہیں دی بلکہ حقائق تک پہنچنے کے سلسلے میں معروضی طریقہ اپنایا۔ حضرت کی شاعرانہ حیثیت متعین کرنے میں یہی موقف رہنما رہا۔

اس ذیل میں اپنے مقالہ کے نگراں جناب ڈاکٹر سید عبدالوہاب اشرفی صاحب، صدر شعبۂ اُردو رانچی کا ممنون ہوں کہ موصوف نے میری قوت نقد اور فکر تحقیق کا اعتبار کیا تاکہ میں اپنے طور پر "حضرت صاحب" کی شاعرانہ عظمت متعین کرسکوں۔ چونکہ جناب اشرفی سے میرے تعلقات دیرینہ ہیں، وہ کل بھی میرے دوست تھے اور آج بھی ہیں اس لئے ادبی نکات کے افہام و تفہیم میں کوئی مصنوعی دیوار حائل نہیں ہوئی۔ ہاں وہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ مقالے کو خواہ مخواہ طول نہ دیا جائے، اختصار اور جامعیت ہمیشہ مدِ نظر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں بہت اہم امور ہی زیرِ بحث لائے گئے ہیں — فروعی اور ضمنی باتیں کم سے کم بیان ہوئی ہیں۔

چونکہ والد محترم محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسیؒ کی قلمی کتاب

"مناقب کمالیہ" اس مقالے کی سب سے قوی محرک رہی ہے اس لئے ان کی یاد اس وقت کچھ زیادہ ہی آرہی ہے اور میرے قلب و جگر پر ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ جس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ہاں آنسوؤں کے چند قطرے ہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں اُن کی خاکِ پا کے وسیلہ سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور بلندی درجات عطا فرمائے۔

برادرِ محترم مولانا طیبؔ عثمانی ندوی ایک ادیب اور دانشور کی حیثیت سے معروف ہیں۔ موصوف کی کتابیں "حدیث اقبال"، "افکار و اقدار" اور "حیات دوام" کافی پسند کی گئی ہیں۔ انھوں نے ازراہِ شفقت میرے موضوع سے دل چسپی لی اور مجھے تحقیق و تنقید کے پیچ و خم سے آگاہ فرمایا اور اس تحقیقی پروجیکٹ کو آگے بڑھانے میں میری رہنمائی کی۔ موصوف کا شکریہ کیا ادا کروں ہم بس ایک جان دو قالب ہیں۔

میں برادرِ مکرم الحاج حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کا بھی ممنون ہوں کہ موصوف کی عنایتوں سے حضرت شاہ کمالؒ کے بعض احوال سے واقف ہو سکا۔

پروفیسر سید حسن عسکری اور پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی بھی شکریئے کے مستحق ہیں کہ ان حضرات نے تحقیق کے بعض مرحلے میں میری معاونت فرمائی اور میری مشکلیں حل کیں۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔

شاہ حسن عثمانی
صدر شعبۂ اردو
ورکرس کالج، جمشید پور

حصّہ اوّل

حیاتِ کمالؒ

باب اوّل

(الف) اُردو زبان کی نشوونما میں صُوفیائے کرام کا حِصّہ

(ب) بہار میں صوفیائے کرام کے سلاسِل

باب دوم

سوانح حیات

باب اوّل

اُردو زبان کی نشوونما میں صُوفیائے کرام کا حِصّہ

زبان کی پیدائش اور اس کا ارتقاء

زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے، جب سے انسان کا وجود ہوا، اس نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے کچھ اشارے کئے، آوازیں پیدا کیں اور کچھ بولیاں نکالیں، اِن بولیوں نے الفاظ کا روپ دھارا اور یہی الفاظ انسانی خیالات و جذبات کے سمجھنے سمجھانے کا وسیلہ بنے۔ اِس طرح رفتہ رفتہ صدیوں میں زبان کا ارتقا ہوا، گویا انسانیت کا آغاز اور زبان کی ابتدا دونوں ایک ساتھ عمل میں آئے۔ ویسے تاریخی طور پر نوعِ بشر کا آغاز ایک بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ ہے اور اِس سلسلہ میں علماء، مفکرین اور ماہرین علم الانسان کی رائیں مختلف ہیں۔ آج تک ایسے تاریخی شواہد نہیں فراہم ہوسکے ہیں کہ نوعِ انسانی کے آغاز و ارتقاء کے پُرپیچ راہوں کا تعین کیا جاسکے۔ اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ بھی کہا یا لکھا گیا ہے اس میں بھی اہلِ نظر و خبر کے درمیان اختلاف ہے، بہرنوع نوعِ بشر کے آغاز و ارتقاء کے ساتھ ہی بولیوں اور زبان کی ابتدا ہوئی، ہر زبان کا آغاز کسی بولی (DIALECT) سے ہوا پھر یہ ترقی کرنے اور پھیلنے والی بولی زبان (LANGUAGE) تک پہنچی۔ زبان کی پیدائش کے سلسلہ میں ماہرین لسانیات نے دو اہم نظریئے پیش کئے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ :۔

> " زبان الہاماً پیدا ہوئی، یعنی زبان براہ راست ودیعت فطرت ہے۔ جس میں ارادہ کا کوئی دخل نہیں [1]۔ "

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ، صفحہ ۳ ، از اختر اورینوی

دوسرا نظریہ جو وہبی اور الہامی نظریہ کا مخالف ہے۔ اس امر کو پیش کرتا ہے کہ زبان کی پیدائش ارتقائی طور پر ہوئی:۔

"اس کی سماجی ضروریات نے اسے اظہارِ خیال پر مجبور کیا اور اس کی ترقی یافتہ جسمانی اور دماغی ساخت نے اسے اظہار خیال کے وہ ذرائع دیئے جن تک جانوروں کی رسائی نہ تھی۔" ۱؎

یہ کسبی اور ارتقائی نظریہ ہمیں اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ بچہ اپنی ماں کی گود اور پھر ماحول سے زبان سیکھتا ہے، اور ابتدائی انسانوں نے بھی اسی طرح زبان سیکھی ہوگی، اس طرح زبان کے ارتقاء میں صدیاں بیت گئی ہیں۔ زبان کی ابتدا اور پیدائش کے اِن متضاد نظریوں کے مقابلہ میں مشہور ماہر لسانیات محی الدین قادری زور کی یہ بات زیادہ قرین قیاس اور متوازن ہے کہ:۔

"انسان میں زبان سے کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعت الٰہی ہے۔ مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیات کی مدد سے ظاہر کرتا ہے، زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے۔" ۲؎

اُردو زبان کا آغاز

اُردو زبان اپنی اصل کے اعتبار سے آریائی زبان ہوتے ہوئے بھی ہندو مسلم تہذیب کی پیداوار ہے۔ یعنی اس زبان کو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے متحدہ تمدن و تہذیب نے پیدا کیا۔ جس وقت اس زبان کی بیج اس سرزمین میں رکھی جا رہی تھی اس وقت اس ملک میں مختلف انقلابی رجحانات اُبھر رہے تھے، پرانی سماجی زندگی برف کی طرح پگھل رہی تھی اور تغیّر و تبدّل کے تیز دھارے سے

۱؎ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، صفحہ ۲۰، از احتشام حسین

۲؎ ہندوستانی لسانیات، صفحہ ۲۸، از محی الدین قادری زور

ہندوستانی زندگی، سماج، سیاست و معیشت، زبان و ادب، علوم و فنون سب متاثر تھے اور سبھی منقلب ہو رہے تھے یہ زمانہ تغیر بڑا اہم ثابت ہوا۔ بقول اختر اورینوی :-

"بودھ مذہب کا اثر ختم ہو رہا تھا اور برہمن اپنے فلسفہ کو نیا رنگ دینے میں مشغول تھے، نئی قومیں اور نئے تمدن ملک میں داخل ہونا شروع ہوئے، دو بڑی تہذیبوں ہندو مسلم کا تصادم اور پھر اختلاط ہوا۔ اس عہد کی بھاشائیں سیال حالت میں تھیں اور انقلاباتِ زمانہ کا اثر قبول کر رہی تھیں۔ چٹرجی کی رائے کے مطابق اگر ہندوستان پر مسلم قبضہ نہ بھی ہوتا تو بھی لسانی تبدیلیاں رونما ہوتیں اور ایک نیا لسانی دور شروع ہو کر رہتا لیکن نئی ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور ان کے اندر ادب کی تخلیق اتنی جلد نہ ہوتی، اگر مسلمانوں کے زیر اثر ایک نئی تہذیبی دَور کا آغاز نہ ہو جاتا۔" ۱؎

جس وقت اس زبان کی داغ بیل پڑ رہی تھی ہندوستان مختلف تہذیبوں، بولیوں اور زبانوں میں بٹا ہوا تھا۔ مسلمان ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل چکے تھے اور مختلف علاقوں میں میل جول سے اُردو زبان کی نئی تشکیل عمل میں آ رہی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اُردو زبان کے ارتقا میں عربی و فارسی زبانوں کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ لیکن چونکہ اِس زبان کا نشو و نما مختلف علاقوں اور زبانوں کے درمیان ہو رہا تھا اس لئے اس زبان کی تشکیل میں مختلف زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، ہریانی، برج بھاشا، کھڑی بولی سب کا ہاتھ رہا ہے۔ پھر اُردو کی یہی قدیم شکل دکن اور گجرات پہنچی اور وہاں کی مقامی بولیوں کے ساتھ اس کا نیا ہیولیٰ بننا شروع ہوا، یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اہلِ دکن نے اسی اُردو کا نام دکنی اور اہلِ گجرات نے اسے گجراتی یا گجروی کے نام سے پکارنے لگے اس طرح اس مخلوط زبان کی نشو و نما مختلف مقامی زبانوں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہونی شروع ہوئی اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ :-

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اَودھ، دکن، پنجاب اور ہر جگہ کی صوبہ دار

۱؎ بہار میں اُردو زبان کا ارتقاء صفحہ ۳۸ از اختر اورینوی

زبانوں سے مل کر صوبہ بہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔" ؎۱

مختصر یہ کہ اُردو زبان ہندوستانی یا کھڑی بولیوں سے پیدا ہوئی اور مختلف علاقوں اور مقامی بولیوں سے مِل کر ترقی کرتے، اَدلتے بدلتے کچھ دوسروں کو دیتے اور کچھ دوسروں سے لیتے اس حالت کو پہنچی جسے ہم آج اُردو زبان کہتے ہیں۔

اُردو زبان کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ

ہندوستان میں صوفیائے کرام کی آمد سے جہاں شرک و بت پرستی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں توحید کی روشنی پھیلی اور اسلامی تعلیمات کے لئے راہیں ہموار ہوئیں، وہیں عوام کی زبان اور ان کی بول چال کو جاننا اور اپنانا ان اہل اللہ کے مشن کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ صوفیائے کرام جن کا مقصدِ زندگی ہی انسانوں سے محبت کرنا اور ان تک اپنا پیغام پہنچانا تھا، جو اپنے مہر و محبّت، طبیعت کی نرمی اور ملائمت، مزاج کی فروتنی اور خاکساری اور عمل کے اخلاص سے دلوں کو جیتتے اور مسخر کرتے اور اسلامی اخلاق و تعلیمات کی روشنی سے عام انسانوں کی زندگیوں کو منوّر کرتے اِس برِعظیم ہند میں پھیل گئے۔ یہ مسلمان فقراء اور درویش ہندوستان جیسے عظیم ملک کے دور دراز خطّوں اور علاقوں میں پہنچے اور اپنے اس مقصد کے مشن کی تکمیل میں پُرخطر اور دشوار گذار راستوں، سر بفلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے، جہاں انسانیت ظلم و جہالت کے پتھّر کے نیچے دبی کراہ رہی تھی، شرک و بُت پرستی کا دار و دورہ تھا، توحید کے تصوّر سے ذہن خالی اور اسلام کی سادہ و دل نشیں تعلیمات اور اخلاقی اقدار سے وہ یکسر محروم و ناآشنا تھے۔ جہاں کی ہر چیز ان کے لئے اجنبی تھی۔ رہن سہن، آدابِ اطوار، لباس، بول چال غرض کہ کسی چیز سے بھی وہ مانوس نہ تھے بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں اہلِ ملک کو ان سے اور ان کو اہلِ ملک سے نہ صرف یہ کہ دوری اور بُعد تھا بلکہ ایک دوسرے سے اجنبیت و وحشت تھی، لیکن اپنے ایمان و یقین کی روشنی اور عمل کی گرمی سے وہ بے خوف و خطر مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک پھیل گئے۔ صوفیائے کرام کے وہ تمام سلسلے جو دراصل اُن کے مشن کی تنظیمی و روحانی

؎۱ نقوشِ سلیمانی صفحہ ۲۵ از سید سلیمان ندوی

سلسلے برعظیم ہند میں بہت مقبول ہوئے۔ چشتیہ سلسلہ اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ پورے ہندوستان میں پھیلا، سہروردیہ کے فیوض سے سندھ و پنجاب کی سرزمین زیادہ سیراب ہوئی۔ قادریہ سلسلہ کی تعلیمات اور روشنی سے شمالی ہندوستان کی سرزمین منوّر ہوئی۔ مجددی نقشبندی سلسلہ نے اس ملک میں روحانی اور سیاسی انقلابات پیدا کئے اور فردوسیہ سلسلہ کے برکات بہار کی خاک پاک پر پڑے۔ اس طرح صوفیائے کرام کے یہ مختلف سلاسل اپنے مشن کی تکمیل میں سرزمینِ ہند کے چپے چپے پر اپنے اثرات ڈالے اور رشد و ہدایت کی روشنی سے انسانی دلوں کو منوّر کیا۔

لیکن دلوں تک پہنچنے کے لئے زبان کا ذریعہ ناگزیر تھا۔ ہم زبانی سے پہلے ہم خیالی ممکن نہیں تھی۔ فقیر کی جھونپڑی (یعنی خانقاہیں) شاہ و گدا سب کے لئے عام تھی، خاص و عام کی کوئی تفریق نہ تھی بلکہ خواص سے زیادہ عوام کے لئے وہ اپنی سادگی اور درویشی کے باعث وجہ کشش تھے۔ تبلیغ و تلقین کے لئے جہاں دوسرے ذرائع اور انداز انہوں نے برتے وہیں اپنی بات کو پہنچانے اور ان کی بات سمجھنے کے لئے اصل ذریعہ زبان کو اختیار کیا۔ اس مقصد کی خاطر مقامی بولیوں اور زبان کو سیکھا اور ان کو بے تکلف استعمال کیا، یہ تمام صوفیائے کرام اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل اور زبان داں تھے۔ عربی و فارسی زبان کے ماہر اور ادیب و انشاپرداز ہونے کے باوجود عوام سے وہ انہیں کی زبان، لہجے اور انداز میں باتیں کرتے یہ ایک ایسا گُر تھا جس کو یہ صوفیائے کرام خوب سمجھتے تھے انہیں عوام میں رہنا اور ان ہی میں کام کرنا تھا اس لئے ان کے دلوں تک پہنچنے کے لئے ان کی زبان میں بات چیت کرنا ان کے لئے وجہ عار نہ تھا۔ اُردو زبان کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ اس زبان کی داغ بیل ان روحانی بزرگوں کے ہاتھوں پڑی۔ میرے خیال میں آج بھی اس زبان میں جو خوبی، دل کشی اور دل رُبائی ہے اور جیسی تازگی و شادابی پائی جاتی ہے۔ اس کی لسانی اور فنی توجیہات چاہے جو بھی کی جائے ایک بڑی وجہ ان پاکیزہ روحانی و اخلاقی شخصیتوں کا خلوص ہی تھا، جو اس زبان کی ابتدائی نشوونما میں کام آیا۔

ان صوفیائے کرام کی ملفوظات و تصنیفات جب ہم پڑھتے ہیں تو جابجا ان میں ہندی اقوال اور ہندی و فارسی کا امتزاج ہمیں ملتا ہے جس نے بعد میں ریختہ کی شکل اختیار کی۔

حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کے ہندی اقوال اور ایک نظم کا تذکرہ مولوی ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں کیا ہے۔ نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں جن سے اس دَور کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے ؎

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک — پیش رو اصفیاء کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے — جو کرڑ واں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گا بکھرے، بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

کتب خانہ الاصلاح دیسنہ کی ایک قلمی کتاب میں حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کی یہ غزل ریختہ لکھی ہوئی ملی ہے ؎

وقتِ سحر وقت مناجات ہے — خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس بیادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
پند شکر گنج کہ بدل جان شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

شیخ حمیدالدین ناگوریؒ کے بارے میں ہے کہ اُن کے گھروں میں ہندی بول چال کا رواج عام تھا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں نے ہندی کے نام سے جو زبان استعمال کی اور جو کچھ مدت تک باوجود تغیر و تبدل کے ہندی کہلائی اور بعد میں یہی زبان اُردو کے نام سے مشہور ہوئی اور یہی زبان اس ملک میں ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔

شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے مرید خاص حضرت امیر خسروؒ سبھوں نے مقامی بولیوں کو استعمال کیا اور اپنے مقاصد کے اظہار کا ذریعہ بنایا خصوصاً امیر خسروؒ نے ہندی نظمیں اور دوہے لکھے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں امیر خسروؒ کا یہ قطعہ لکھا ہے ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ریختہ اسی کا نام ہے جس میں فارسی اور ہندی دونوں ملی ہوئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر خسرو پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سرزمین میں اُردو زبان کا بیج بویا اور یہیں سے اُردو کی ابتدا ہوئی۔

ان کے علاوہ شیخ سراج الدین عثمانؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ یہ سب بزرگ مقامی اور وطنی بولیوں کو بلا تکلف بولتے تھے اور عوامی زبان کے استعمال کو کبھی عار نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کو اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے۔ حضرت گیسو دراز بندہ نواز جو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے خلیفہ اور مرید تھے اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد دکن پہنچے اور سرزمین دکن کو اپنی تعلیم و تلقین سے فیض یاب کرتے رہے۔ آپ کا دستور تھا کہ نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث و فقہ اور تصوف و سلوک کا درس دیا کرتے تھے، جو لوگ عربی و فارسی سے واقف نہ تھے ان کو سمجھانے کے لئے ہندی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔ اسی طرح گجرات میں حضرت قطب عالم شاہ عالمؒ، اترپردیش اودھ میں حضرت سید محمد جون پوریؒ، حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ تھے۔ سب مقامی بولیوں کو جانتے تھے اور خصوصاً اردو کی ابتدائی شکل جسے وہ ہندی کہتے تھے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے تھے۔

یہ اہلِ دل صوفیائے کرام ہندوستان کے ہر صوبے، علاقے اور خطے میں پھیلے ہوئے تھے، جو علم و یقین کی روشنی پھیلاتے، محبت کا پیغام سناتے اور بندگانِ خدا کے دلوں میں گھر کرتے تھے۔ یہ سب بزرگ حقیقی اسلامی تصوف کے عَلَم بردار اور اہل اللہ تھے، جو مخلوق خدا کی ہدایت پر مامور تھے اور جن کا اثر ملک کے خواص و عوام سب پر تھا۔ اہلِ ملک کے ساتھ میل جول بڑھانے اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے کے ساتھ ان لوگوں نے اپنی اور مقامی زبانوں کو بھی ملانے کی ارادی اور غیر ارادی کوششیں کیں۔ اس میل جول اور ارتباط سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے شروع میں ہندی پھر ہندوستانی اور اردو کہا جانے لگا۔ یہ ان بزرگوں ہی کا اثر تھا کہ سندھ، پنجاب، دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد سے لے کر دکن، بیجاپور اور گجرات تک اس زبان کو فروغ ہوا اور ان جگہوں میں اس زبان کے بڑے بڑے خوش بیان و بلند خیال شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و نثر نگار پیدا ہوئے۔ ان صوفیائے کرام نے اس زبان کو عوام کے اندر رہ کر عوام کے لئے استعمال کیا، اس میں شاعری بھی کی اور نثر نگاری بھی۔ ان بزرگوں کی نظمیں اور نثری

تصنیفات اگر ایک طرف لوگوں کے لئے شمع ہدایت تھیں تو دوسری طرف ان کی یہ ادبی و شعری کوششیں اُردو نظم و نثر کو آگے بڑھانے اور ان کو ایک نیا اسلوب و انداز بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ اُس دور میں عام طور پر اہلِ علم و ادب اس نئی زبان میں لکھنا پڑھنا اپنے لئے عار سمجھتے تھے لیکن یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنھوں نے اس بازاری اور عوامی زبان کو شرف بخشا اور اس کے استعمال کو اپنے لئے عار نہ سمجھا بلکہ اس کو وہ عزت بخشی کہ ان کے دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس کا استعمال اپنے شعر و سخن اور مذہب و تعلیم میں شروع کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں ان صوفیا کرام ہی کا فیض اور اِن کی کوششوں کا بڑا حصّہ ہے۔ یہ اُردو کے کوئی بڑے شاعر اور ادیب نہ تھے اور نہ اِن کے پیشِ نظر زبان و ادب کی ترقی تھی لیکن اِن کے سامنے جو عظیم مقصد تھا اُس کا وسیلۂ اظہار انہوں نے اسی زبان کو بنایا اور یہی چیز اِس زبان کی نشوونما اور شعری و ادبی ارتقاء کا باعث بنی۔ اِس لحاظ سے یہ صوفیائے کرام اُردو کے سب سے بڑے محسن ہیں اور اُردو زبان کا مؤرخ اِن کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

بہار میں صوفیائے کرام کے سلاسل
اور
صوفی خانوادے

سرزمین بہار اپنی مردم خیزی اور اپنے علمی و دینی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہی ہے۔ جہاں اس خاک سے ادیب و شاعر، فقیہہ و عالم اور مؤرخ و محقق اُٹھے وہیں صوفی باصفا شیوخ وقت اور مجاہدین دین وملت سے بھی یہ سرزمین بھری پڑی ہے۔ خصوصاً اہلِ دل صوفیائے کرام اور درویش صفت شیوخِ طریقت کے روشن نشانات اس صوبہ کے چپہ چپہ پر نمایاں ہیں۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی رح:-

"بہار کی آب و ہوا میں اخلاقی تزکیہ یا دل و دماغ کو جہل و نادانی کی گندگی سے پاک و صاف کرنے کی قدرتی خاصیت، قدرت کی طرف سے بخشی گئی ہے۔"

اس قول پر بہار کی تاریخِ صوفیا، مہرِ تصدیق لگاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خاک پاک سے بڑے بڑے صوفیائے کرام اور اہل اللہ پیدا ہوئے جن کے علم و معرفت کی روشنی سے نہ صرف یہ کہ بہار کی سرزمین منوّر ہوئی بلکہ ان کی روشنی سارے ہندوستان میں پھیلی۔ ان صوفیائے کرام نے اپنے سلاسل کے ذریعہ اجتماعی رشد و ہدایت اور انفرادی اصلاح و تزکیہ کا کام منظم طور پر انجام دیا اور پورے ہندوستان میں یہ صوفیائے کرام اپنے مشن کی ترویج و اشاعت میں پھیل کر گھر گھر اسلام کا چراغ جلاتے رہے اور انسانی دلوں کو اسلامی اخلاق اور معرفتِ الٰہی کی روشنی سے منوّر کرتے رہے۔ رشد و ہدایت اور علم و معرفت کے اس کام میں بہار نے اپنا حصّہ، حصّہ رسدی سے کچھ زیادہ ہی ادا کیا۔

تصوّف کی ابتدائی تاریخ اور سلاسِل صوفیہ

تصوف کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ حقیقی تصوف کتاب و سنّت کے زیرِ اثر روحِ دین پر عمل کرنے کا نام ہے جسے احادیث صحیحہ میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد، جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور اموی خلفاء نے خلافت کے بارگراں کو اپنے ذاتی اقتدار اور دنیاوی جاہ و حشمت کے لئے استعمال کرنا شروع کیا، جس کے نتیجہ میں حادثۂ کربلا، محاصرہ مکّہ اور واقعہ حرّہ جیسے الم ناک و شرمناک فتنے پیدا ہوئے تو ان ہی حالات کے پس منظر میں صوفیائے کرام کا پہلا طبقہ عالم وجود میں آیا جو دُنیا سے منہ موڑ کر ذکر الٰہی اور خشیت خداوندی میں غرق ہوگیا، صوفیائے کرام کا یہ پہلا گروہ جن میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت مالک دینارؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت خواجہ فیصل بن عیاضؒ اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے اسمائے گرامی بہت نمایاں ہیں ان کا مرکز بصرہ اور کوفہ بنا کیوں کہ یہ دونوں شہر اموی گورنروں کے ظلم و ستم کے سب سے زیادہ آماجگاہ بنے رہے تھے۔ اس دور کے صوفیائے کرام کی بڑی خصوصیت ان کی خشیتِ الٰہی ہے۔ وہ خوفِ خدا سے ہر وقت لرزاں و ترساں اور دنیا اور اہلِ دنیا سے گریزاں رہتے۔

عبّاسی دورِ حکومت میں جب عجمی افکار و نظریات پھیلنے شروع ہوئے عقلیت اور یونانی فلسفہ و حکمت کی آندھی نے عوام کے عقاید و خیالات کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں، ایمان و یقین کی جگہ تذبذب و تشکیک نے لے لی، عقلیت و تشکیک کے زہریلے اثرات نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں انتشار و پراگندگی پیدا کردی، ذات و صفات باری تعالیٰ پر مباحثے ہونے لگے، خلق قرآن کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا، دوزخ، جنّت، معراج و معجزات کو عقل کی کسوٹی پر کسا جانے لگا۔ ایسے دورِ پُرفتن میں صوفیائے کرام نے کتاب و سنت کی مشعل روشن کی اور یقین کا چراغ جلایا اور اس فتنہ کے خلاف سدِ سکندری بن کر کھڑے ہوگئے، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت سری سقطیؒ اور حضرت ذوالنون مصریؒ جیسے بزرگ پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف اس فتنہ پر قابو پایا بلکہ اپنے علم و یقین اور مشاہدۂ حق کے ذریعہ عوام کو اسلام کے جادۂ اعتدال سے ہٹنے

نہیں دیا۔ ان صوفیائے کرام نے تسلسل کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھا اور چراغ سے چراغ جلتے رہے۔
یہاں تک کہ بارہویں صدی عیسوی کے مشائخ حضرت امام غزالیؒ (المتوفی ۱۱۱۱ء)، حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ (المتوفی ۱۱۶۶ء)، حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ (المتوفی ۱۲۴۰ء)، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (المتوفی ۱۲۳۴ء)، حضرت نجم الدین کبریٰ فردوسیؒ (المتوفی ۶۱۸ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
اِن بزرگوں نے اپنی تصانیف، وعظ و ارشاد اور پند و نصائح سے دین کی بڑی خدمت کی، حضرت امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی "عوارف المعارف" جیسی گراں قدر تصانیف لکھی گئیں۔ جنھوں نے انسانی زندگیوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور ان سے ایمان و یقین کی ایسی کیفیات پیدا ہوئیں کہ شک و ریب اور عقل و فلسفہ کے سارے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور تصانیف "غنیۃ الطالبین" اور "فتوح الغیب" نے اصلاح و ہدایت کا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اِن بزرگوں کا سلسلۂ رشد و ہدایت جاری تھا۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی عیسوی کے مشائخ صوفیاء میں حضرت سیف الدین باخرزیؒ، حضرت بدرالدین سمرقندیؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے اہل اللہ پیدا ہوئے۔ حضرت سیف الدین باخرزیؒ اور حضرت شیخ بدرالدین سمرقندیؒ کی خدمات جلیلہ اور رشد و ہدایت سے سلسلہ فردوسیہ کا عروج ہوا اور اس سلسلہ کے سب سے زیادہ اثرات حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے مبارک ہاتھوں سے بہار کی سرزمین پر پڑے جنھوں نے بہار کی کفر و ضلالت سے بھری سرزمین کو رشد و ہدایت کا راستہ دکھلایا اور اسلام کی روشنی سے منور کیا۔

صوفیائے کرام کے سلاسل گرچہ یوں تو بہت سے ہیں، ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں ہندوستان کے اندر چودہ سلاسل کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ مشہور سلاسل جو ہندوستان میں بہت زیادہ پھیلے اور جن کے سلسلوں کی اشاعت بہت زیادہ ہوئی ان میں عام طور پر چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، نقشبندیہ اور فردوسیہ چھ سلسلے مشہور ہیں۔[1]

---

[1] تاریخ سلسلۂ فردوسیہ صفحہ ۶۹ از محمد معین الدین دردائی ایم اے

۱۔ **چشتیہ :** ہندوستان میں سب سے پہلے اسی سلسلہ نے کام شروع کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پرتھوی راج کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے اور اجمیر میں مقیم ہو کر اسلام کی اشاعت اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔

۲۔ **سہروردیہ :** سلسلۂ چشتیہ کے بعد یہ سلسلہ ہندوستان میں پہنچا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے خلافت حاصل کر کے ہندوستان تشریف لائے، اپنے کام کے لئے ملتان کو پسند فرمایا اور وہیں مقیم ہو گئے۔ اس سلسلہ کی زیادہ تر خانقاہیں ملتان اور سندھ تک محدود ہیں۔

۳۔ **قادریہ :** یہ سلسلہ پندرھویں صدی کے وسط میں قائم ہوا۔ اس کو شاہ نعمت اللہ قادریؒ نے ہندوستان میں قائم کیا اور پھر سید غوث گیلانیؒ، مخدوم شیخ عبد القادر ثانیؒ، شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اس سلسلہ کو عہد مغلیہ میں فروغ دیا۔

۴۔ **شطاریہ :** یہ سلسلہ شاہ عبد اللہ شطاریؒ نے قائم کیا تھا، سید محمد غوث گوالیاریؒ اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتیؒ نے اس کو ہندوستان میں ترقی دیا۔

۵۔ **نقشبندیہ :** اس سلسلہ کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہؒ نے شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں قائم کیا۔ ان کے بعد ان کے خلیفہ شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ نے اس سلسلہ کی اشاعت کی اور اس کو مقبول عام بنایا۔ بعد میں یہ سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

۶۔ **فردوسیہ :** اس سلسلہ کو ہندوستان میں حضرت سیف الدین باخرزیؒ کے خلیفہ حضرت بدر الدین سمرقندیؒ لائے اور پھر اس کو حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے معراج کمال تک پہنچایا۔ ان کے جانشینوں میں حضرت مولانا مظفر بلخیؒ، حضرت حسین نوشہ توحیدؒ جیسی بزرگ ہستیاں پیدا ہوئیں جن سے اس سلسلہ کی اشاعت میں بہت تقویت پہنچی اور بہار کی سرزمین ان فردوسی بزرگوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

بہار کی سرزمین جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اخلاقی تزکیہ اور علم معرفت کا خصوصی گہوارہ رہی ہے۔ اس خطۂ پاک پر فردوسی بزرگوں کے سب سے زیادہ اثرات پڑے ہیں اور دوسرے سلاسل کے

بزرگوں نے بھی اپنے سلسلہ کی اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اس طرح مختلف خانوادوں اور خانقاہوں نے اس سرزمین میں دین کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیا ہے اور حقیقی اسلامی تصوف کو روشناس خلق کرایا ہے یوں تو بہار میں چھوٹی بڑی بہت سی خانقاہیں اور صوفی خانوادے ہیں لیکن چند خانقاہیں اپنے کام کی وسعت اور عوام و خواص میں مقبولیت کے باعث خاص طور پر نمایاں ہیں خصوصًا حضرت مخدوم الملکؒ کی جائے پیدائش اور وطن منیر شریف آپ کی خانقاہ مخدوم جہاں بہار شریف ان کے علاوہ پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ حضرت تاج العارفین مشہور و معروف ہیں اور گیا ضلع میں استھاواں کی خانقاہ اور وہاں کے صوفی خانوادے حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی خانقاہ برہانیہ کمالیہ فردوسیہ، حضرت دیورہ اور خانقاہ امامیہ مجیبیہ فردوسیہ سملہ پاک قابل ذکر ہیں۔

منیر شریف

منیر پٹنہ سے بیس[۱] میل پچھم ایک تاریخی قصبہ ہے جو شروع ہی سے علمی و دینی اور روحانی مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ مشہور بزرگ حضرت امام تاج فقیہہؒ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا قدم منیر شریف میں آیا، حضرت صوفی منیریؒ[۱] نے حضرت امام تاج فقیہہؒ کے حال میں لکھا ہے کہ منیر کا راجہ بہت ظالم اور سرکش تھا اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتا تھا۔ حضرت امام محمد تاج فقیہہؒ شہر بیت المقدس کے محلہ قدس خلیل[۲] میں رہتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور فرمانِ جہاد صادر ہوا۔ صبح کو آپ نے ارادۂ سفر اور عزم جہاد کا اعلان فرمایا اور بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کیا۔ جب لشکرِ اسلام سرحدِ ہندوستان پر آیا تو وہاں سے جہاد کرتا ہوا منیر شریف تک پہنچا،

۱؎ وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت صفحہ ۴۷ از حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیریؒ مرتبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی

۲؎ قدس خلیل کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے الخلیل (شام) لکھا ہے اب یہ شہر مملکت ہاشمیہ اردنیہ کا ایک شہر ہے جو بیت المقدس سے ۱۵، ۱۶ میل پر واقع ہے۔ اس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شرفاء و صلحاء کی ایک قدیم بستی ہے۔ (دعوت و عزیمت حصہ سوم صفحہ ۱۷۷)

منیر کا راجہ اپنے اہل وعیال کو لے کر کہیں فرار ہوگیا بعض کہتے ہیں کہ راستے میں مجاہدوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس طرح منیر فتح کیا۔ آپ کے تین صاحبزادے شیخ اسرائیلؒ، شیخ اسمٰعیلؒ، شیخ عبدالعزیزؒ ساتھ تھے۔ حضرت امام محمد تاج فقیہہؒ کا دل اس کفرستان میں نہیں لگا، فتح کے بعد اپنے صاحبزادوں کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر وطن واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ اسرائیلؒ، امام تاج فقیہہ کے بڑے بیٹے تھے جن کے صاحبزادے حضرت مخدوم شیخ یحییٰ منیریؒ ہیں۔ آپ کی شادی عظیم آباد کے قدیم بزرگ حضرت قاضی شہاب الدین پیر جگ جوت کی بڑی صاحبزادی رضیہ سے ہوئی جو خود ولیہ کاملہ تھیں۔ آپ کی بطن سے حضرت مخدوم الملک شیخ شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ اسمٰعیلؒ حضرت امام تاج فقیہہؒ کے منجھلے بیٹے اور حضرت شیخ عبدالعزیزؒ چھوٹے صاحبزادے تھے اور آپ ہی کے صاحبزادے مشہور بزرگ مخدوم جلال منیریؒ ہیں۔

منیر شریف کا یہ صوفی خانوادہ حضرت امام محمد تاج فقیہہؒ اور ان کے تینوں صاحبزادوں کی اولاد پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور نیتِ جہاد کی برکت سے رشد وہدایت کا وہ کام ان سے لیا کہ آج بہار کا ہر گوشہ درحقیقت ان ہی کی پھیلائی ہوئی روشنی سے روشن و منور ہے۔

خانقاہ مخدوم جہاں بہار شریف

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل کے بعد بارہ برس بہیا کے جنگل میں غائب رہے پھر اچانک راجگیر کے جنگل میں نمودار ہوئے۔ مخدوم الملکؒ کے راجگیر جنگل میں قیام کی خبر جب رفتہ رفتہ مشہور ہوئی تو طالبانِ رشد وہدایت کی آمد ورفت شروع ہوگئی۔ مولانا نظام الدین مدنیؒ جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ حضرت مخدومؒ کی بزرگی اور عظمت کے بہت زیادہ گرویدہ تھے، اکثر راجگیر چلے جاتے اور ان کی تلاش میں جنگل جنگل مارے پھرتے ان کے ساتھ اور بھی مخدوم کے عقیدت مند اور شیدائی ہوتے۔ آخر مخدوم الملکؒ نے ان لوگوں کی محبت کو دیکھ کر ایک دن فرمایا کہ اس خوفناک جنگل میں آپ لوگ تشریف نہ لایا کریں، میں خود ہی ہر جمعہ کو بہار شریف آکر آپ لوگوں سے ملاقات کیا کروں گا۔ اس کے بعد حضرت مخدوم الملک کا یہ معمول ہوگیا کہ ہر جمعہ کو جامع مسجد بہار شریف تشریف لاتے اور بعد نماز جمعہ وعظ فرماتے۔

کچھ دنوں کے بعد مولانا نظام الدینؒ نے اس جگہ پر جہاں اِس وقت خانقاہ معظم ہے، دو چھپر اگرا دیا اور پھر اسی جگہ پر حضرت مخدوم بعد نماز جمعہ وعظ و نصیحت فرماتے اور کچھ دیر وقت گزارتے۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا نظام الدینؒ نے اس جھونپڑے کو بنوا کر ایک مکان میں تبدیل کر دیا اور حضرت مخدوم الملکؒ کو بہت التجا اور اصرار کے بعد وہاں مستقل قیام پر راضی کر لیا۔ مستقل قیام کے بعد مخدوم الملکؒ کے رشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا کام بہت بڑھ گیا اور وہاں عبادت و ریاضت کے ساتھ تبلیغ و اسلام اور تزکیہ و اصلاح کے کام میں مشغول ہو گئے، آپ کی مقبولیت اور شہرت دن بدن بڑھتی گئی اور خلقِ خدا آپ سے فیض یاب ہوتی رہی آپ کی شہرت سُن کر سلطان محمد تغلق نے دہلی سے بہار کے گورنر مجد الملک کو فرمان بھیجا کہ مخدوم الملک شیخ شرف الدینؒ کے لئے خانقاہ بنوا دیں۔ اور ان کے اخراجات کے لئے پرگنہ راجگیر نذر کیا جائے جب گورنر نے بادشاہ کا فرمان او زندرانہ پیش کیا اور یہ عرض کیا کہ اگر حضور نے نہ قبول فرمایا تو بادشاہ کے یہاں میری خیر نہیں۔ تو اپنی مرضی کے خلاف حضرت مخدوم الملکؒ نے بادشاہ کے نذر کو قبول کر لیا۔ لیکن سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد جب سلطان فیروز تغلق تخت نشیں ہوا تو مخدوم الملکؒ بہ نفس نفیس دہلی تشریف لے گئے اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر جاگیر داری کے فرمان اور دستاویز کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جاگیر داری ہم فقیروں کی روش کے خلاف ہے۔ اِس لئے مجھ کو اس عنایت سے معاف فرمایا جائے فیروز تغلق اور اس کے درباری آپ کی اِس بے نیازی اور درویشی کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ آپ دہلی سے درویشانہ بہار واپس ہوئے اور خانقاہ کے گوشہ میں بیٹھ کر تحریر و تقریر اور درس و تدریس کے ذریعہ تقریباً ۵۲ سال مخلوقِ خدا کی خدمت اور رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ آپ کے بے شمار تصانیف، مکتوبات اور ملفوظات ہیں جو آج بھی مخزنِ علم و عرفان اور منبعِ فیوض و برکات ہیں۔

حضرت مخدوم الملکؒ کے وصال کے بعد مسند سجادگی پر حضرت مولانا مظفر بلخیؒ جلوہ افروز ہوئے جنھیں مخدوم الملکؒ سے کوئی نسبی لگاؤ نہ تھا ان کے بعد چھ مشائخ سلسلہ وار خاندان بلخیہ ہی سے خانقاہ مخدوم جہاں کے سجادہ ہوتے رہے۔ تقریباً ایک سو تیس برس کے بعد حضرت مخدوم شیخ حافظ درویش بلخی فردوسیؒ از راہ محبت و احترام برضا و رغبت خاندان شرفیہ کے ایک گوہر تاباں حضرت مخدوم شاہ محمد بھیکھؒ کو مسند سجادگی پر بیٹھا کر خود علیحدہ ہو گئے اس وقت سے

آج تک خانقاہ مخدوم الملکؒ کی سجادگی اِن ہی کے خاندان کے لوگوں میں چلی آرہی ہے اور آج بھی مخدوم الملکؒ کی یہ خانقاہِ معظم مرجعِ خلائق ہے۔

خانقاہ مجیبیہ حضرت تاج العارفین پھلواری شریف، پٹنہ

پھُلواری ایک مردم خیز خطّہ ہے جس میں علماء وصوفیا، قضاۃ وقت اور ادباء و شعراء ہر دَور میں پیدا ہوتے رہے اپنے علمی و عرفانی خصوصیتوں کے لحاظ سے بہار کے اِس قصبہ کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ "آثارات پھلواری شریف موسوم بہ اعیانِ وطن" کے مصنف مولانا حکیم سید شاہ محمد شعیب مَنیر پھلواروی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ :-

"روایات اور سابقہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ متبرکہ پھُلواری تقریباً ہزار سال سے آباد ہے۔"

"تذکرۃ الکرام" میں مولانا ابوالحیات قادری پھلوارویؒ نے اس قصبہ کے شرف و بزرگی کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"اس قصبہ پر بزرگوں کے ارواحِ طیبات کی توجہ برابر رہی، حضرت مخدوم الملک بہاری قدس سرہٗ کے ارشاد اور دعا کی بدولت درحقیقت اس قصبہ میں صدہا علماء و فضلاء، مشائخ عارفین باللہ پیدا ہوئے۔"

غرض کہ اس مردم خیز قصبہ سے علم وعرفان کے صدہا نونہالان برگ و بار لائے۔

سب سے پہلے عہدِ فیروز شاہ میں آفتاب ہدایت وعرفان، حضرت مخدوم سید شاہ منہاج الدین راستی قدس سرہٗ جیلان سے بہار تشریف لائے اور حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی صحبت میں حاضر ہو کر علم وعرفان سیکھا اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ ریاضات و مجاہدات اور راہِ سلوک کی تکمیل میں حضرت مخدومؒ نے آپ سے سخت ریاضتیں کرائیں۔ پھر رشد و ہدایت خلق کے لئے حضرت مخدوم الملکؒ آپ کو اپنے ہمراہ اس قصبہ میں

۱؎ آثارات پھلواری شریف صفحہ   از مولانا حکیم محمد شعیب مَنیر پھلواروی

لاکر مسندِ ہدایت پر بیٹھایا اور اِس قصبہ کا نام پھلواری کی مناسبت سے "بستانِ نجات" رکھا۔

حضرت مخدوم راستیؒ کی اِس قصبہ میں تشریف آوری ۶۲۷ھ میں ہوئی جس کے بعد سے اس قصبہ سے کفر وضلالت کی تاریکی چھٹی اور اسلام کی روشنی پھیلی۔ صدہا مشرکین و ہنود مشرف بہ اسلام ہوئے آپ کی رشد و ہدایت کا دور بہت ہی نمایاں رہا۔ تمام عمر فقر و توکل میں بسر ہوئی اور ۲۹ ذی الحجہ ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔ آبادی کے شمال میں ایک خطیرہ میں مدفون ہوئے۔

آپ کے بعد دوسرا خاندان حضرت امیر عطاء اللہ زینبی جعفری قدس سرہٗ کا پھلواری میں آباد ہوا۔ دسویں صدی کے اوائل میں دہلی سے خاندان جعفریہ زینبیہ کے سربرآوردہ بزرگ حضرت سید شاہ محمد سعد اللہ جعفری زینبی اپنے صاحبزادے امیر عطاء اللہؒ کے ساتھ پھلواری جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت امیر عطاء اللہ کی اولاد و امجاد کافی پھیلی اور ان میں بڑے بڑے اہل علم اور اہل اللہ پیدا ہوئے۔ حضرت تاج العارفین مخدوم سید شاہ محمد مجیب اللہ قادریؒ کو آپ ہی سے نسبی و روحانی نسبتیں حاصل ہیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے پھوپھی زاد بھائی اور پیر و مرشد حضرت خواجہ عماد الدین قلندر قدس سرہ العزیز سے ہوئی۔ پھر آپ کی اجازت سے حضرت مولانا سید محمد وارث رسول نما بنارسی قدس سرہٗ کی خدمت بابرکت میں بنارس جاکر زانوئے ادب تہ کیا اور بقیہ درسیات کی تکمیل کرکے فارغ التحصیل ہوئے، پھر حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ حضرت قلندرؒ نے آپ کو کامل و مکمل پایا اور اسی وقت اپنی طرف سے جمیع سلاسل کی اجازت و خلافت دے کر ارشاد و ہدایت خلق کے لئے مامور فرمایا، پھر آپ حضرت مولانا رسول نماؒ کے پاس بنارس تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا نے بھی اپنی طرف سے الباس خرقہ کرکے جمیع سلاسل کا تحریری اجازت نامہ مہر و دستخط سے مزین فرماکر عطا فرمایا، حضرت خواجہ عماد الدین قلندرؒ کے وصال کے بعد آپ نے اپنے وطن پھلواری شریف میں مستقل اقامت اختیار فرمائی اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا۔

حضرت تاج العارفینؒ کی خانقاہ سے روحانی فیوض و برکات بہت پھیلے۔ دورِ حاضر میں فیاض المسلمین حضرت مولانا سید شاہ محمد بدرالدین قادری قدس سرہٗ کی ذات والاصفات اس خانقاہ کی روح رواں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت مولانا شاہ

شرف الدینؒ اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر قدس سرہٗ سے حاصل کی تکمیل طریقت کے بعد اپنے شیخ کی طرف سے جمیع سلاسل مجیبیہؒ جنیدیہ کی اجازت و خلافت سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کے شیوخ حدیث اور شیوخ طریقت کی تعداد بہت کثیر ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ آپ کی ذات مبارک سے بیک وقت خانقاہ جنیدیہ اور خانقاہ مجیبیہ دونوں کی سجادگی وابستہ ہوئی اور دونوں ہی چشمے ایک ہی سوت سے پھوٹے۔ جب علمائے صوبہ بہار و اُڑیسہ نے امارت شرعیہ جیسی دینی تنظیم کا قیام عمل میں لایا تو باتفاق رائے علمائے کرام نے آپ کو امیر شریعت منتخب کیا۔ آپ ۳۲ برس سریر آرائے سجادہ رہے اور برابر رشد و ہدایت اور اقامت دین کی جد و جہد صوبہ بہار میں آپ کی ذات سے وابستہ رہی۔ ۱۶ صفر ۱۳۴۳ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور مقبرۂ مجیبیہ میں اپنے پیر و مرشد کے قریب مدفون ہوئے۔

آپ کے وصال کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین قادریؒ امیر شریعت ثانی سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے دینی و روحانی مقتدیٰ رہے اور ساتھ ہی امیر شریعت بہار کی حیثیت سے مسلمانانِ بہار کی دینی تنظیم کے رہنما بھی تھے۔ چنانچہ ۲۳ برس تک مسند سجادگی سے تصوّف و طریقت کی اشاعت فرماتے رہے اور منصب امیر شریعت کی حیثیت سے دین و ملّت کی خدمتِ جلیلہ انجام دیتے رہے۔ آپ کی ذات فقر و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھی۔ آپ کی وفات ۲۹ جمادی الاول ۱۳۶۶ھ کو ہوئی۔

آپ کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادے جناب مولانا شاہ محمد امان اللہ صاحب قادری مدظلہٗ سجادہ نشیں ہوئے۔ خانقاہ مجیبیہ کے مسند سجادگی پر آپ کی ذات ان دنوں روحانی فیوض و برکات کا باعث ہے اور آپ رونقِ خانقاہ ہیں۔

امتھوا کی خانقاہ اور صوفی خانوادے

جہان آباد سب ڈویژن (ضلع گیا) چھ میل جانب مشرق، امتھوا نام کا ایک دیہات بڑی تاریخی اہمیتوں کا حامل ہے۔ حضرت مخدوم شیخ بدھ صوفی، شیر شاہ سوری کے مرشد و مقتدیٰ غالباً اسی دیہات کے رہنے والے تھے۔ اس لئے کہ شیر شاہ سوری نے شہنشاہ ہونے سے پہلے امتھوا میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کا تاریخی کتبہ اب تک موجود ہے۔

عہد عالمگیر میں اس گاؤں کے دو جلیل القدر علماء حضرت ملاّ محمد شفیع اور حضرت ملاّ محمد فائق "فتاویٰ عالمگیری" کی جمع و تدوین میں شریک رہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی جمع و تدوین سے فراغت کے بعد ان علماء کو ان کی خدمات کی صلہ میں جو جاگیر شہنشاہ عالمگیر نے عطا کی اس فرمان میں دو نام اور ملتے ہیں، حضرت ملا وجیہہ الرب اور ملاّ نظام الدین ۔ یہ ملاّ نظام الدین اگر وہی ہیں جن کی سرکردگی اور نگرانی میں تاریخی کارنامہ انجام پایا تو اس گاؤں کی تاریخی عظمت اور اہمیت بے حد بڑھ جاتی ہے کہ اب تک ملاّ نظام الدین کو اس محکمہ کے انچارج اور سربراہ تھے بدایونی سمجھا گیا، لیکن پرگنہ اوکری میں جو مضافات استھاواں ہے ۔ ملاّ محمد شفیع، ملاّ محمد فائق کی ہمراہی اور اشتراک کا جاگیر کا ملنا، پھر عہد بہ عہد اسی خانوادے میں اس جاگیر کا مسلسل ہوتے رہنا ملا نظام الدین کو استھوی ثابت کرتا ہے اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے تلاش و جستجو کا ایک دل چسپ اور نیا عنوان ہے، جو میرے اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے ۔

اس تاریخی گاؤں میں درس و تدریس، تعلیم و تعلّم، رشد و ہدایت کا فیضان عرصہ سے جاری ہے۔ سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ کے علاوہ یہاں کا محبوب سلسلہ، سلسلۂ قادریہ رہا ہے جو مختلف بزرگوں کے ذریعہ سے یہاں پہنچا ۔ ایک سلسلہ تو وہ ہے جو حضرت میران محی الدین قلندر قادریؒ کے ذریعہ یہاں پہنچا جن کا سلسلۂ نسب صرف دس واسطوں سے حضرت غوث پاک سے ملتا ہے۔ اس سلسلہ کو فروغ حضرت مولوی معنوی ملاّ محمد شفیعؒ سے ہوا۔ جو حضرت میران محی الدین قلندر قادریؒ کے بھانجے اور مسترشد تھے ۔ حضرت مولوی معنوی ملاّ محمد شفیعؒ کی ذات کمالات ظاہری و باطنی کا مجموعہ تھی ۔ مشہور ہے کہ آپ شہنشاہ عالمگیر کے شاہزادوں کے اتالیق و معلّم کی حیثیت سے دہلی میں قیام پذیر تھے۔ لیکن کسی موقع پر آپ سے کوئی کرامت ظاہر ہوگئی جس کے بعد آپ دہلی چھوڑ کر استھاواں آ گئے ۔

دوسرا سلسلہ قادریہ، حضرت مولانا محمد موسیٰ صاحبؒ سے یہاں آیا، جو سلسلہ فردوسیہ کے مشہور اور باکمال بزرگ جناب حضرت مولانا شاہ امین احمد صاحب بہار شریف سجادہ نشیں مخدوم الملکؒ کے استاد اور مرشد تھے اور انھیں سے حضرت مولانا شاہ احمد حسین صاحب استھوی اور عالم علوم ظاہری و باطنی حضرت مولانا شاہ ظہور الحسن قادری استھوی بھی تعلیم پا رہے تھے ۔ حضرت

مولانا شاہ ظہور الحسن قادری اسھتویؒ اپنے عہد کے باکمال بزرگوں میں تھے۔ حضرت مولانا محمد موسیٰ صاحب سے انہوں نے قادریہ سلسلہ کے علاوہ سلسلہ چشتیہ میں بھی اجازت وخلافت حاصل کی تھی۔

تیسرا سلسلہ قادریہ حضرت شاہ کبیر درویش بانی خانقاہ کبیریہ سہسرام کے واسطے سے یہاں آیا جب حضرت شاہ بوڑھن دیوان (سہسرام) کی خانقاہ اور سجادگی بذریعہ مصاہرت حضرت شاہ کبیر درویشؒ کے خاندان اور خانقاہ میں ضم ہوگئی اور اُن کی صحیح جانشین اور اصل وارث حضرت شاہ شمس الدینؒ زیب سجادہ ہوئے تو ان کی تنہا اولاد صرف ایک صاحبزادی تھیں جن کی شادی اسھتوا میں ہوئی ان کے نواسے مولانا شاہ احمد حسینؒ اور مولانا شاہ ظہور الحسن تھے اس طرح یہ سلسلہ بھی اسھتوا میں آکر ختم ہوا۔

عہد جدید میں جو خانقاہ حضرت شاہ محمد حیات رحمۃ اللہ علیہ نے اسھتوا میں قائم کی وہاں سے سلسلۂ نقشبندیہ کا فیضان اب تک جاری ہے اور جناب شاہ نور الحق صاحب عارف اسھتوی زیبِ سجادہ ہیں۔

خانقاہ امامیہ مجیبیہ فردوسیہ سِملہ پاک

ضلع گیا (بہار) کے اورنگ آباد سب ڈویژن میں (جو اب ضلع بن چکا ہے) ایک چھوٹی سی قدیم بستی "سِملہ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں ایک قدیم صوفی عثمانی خانوادہ آباد ہے۔ اِس خانوادے میں شروع ہی سے علماء وصوفیاء اور مجاہدین دین وملت پیدا ہوتے رہے ہیں۔

یہ گاؤں حضرت شیخ محمد کبیر دیورویؒ (ثم ساکن موضع نوبت پور ضلع پٹنہ) کو بطور نذر علاقہ "دُگّل" (جو پرانے دستاویز میں "حویلی دُگّل" کے نام سے موسوم ہے) کے خان راجہ نے پیش کیا تھا۔ اس ضمن کی دل چسپ بات یہ ہے کہ خود خان راجہ کو یہ علاقہ حضرت مولانا شیخ محمد کبیرؒ نے عطا کیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شاہزادہ عظیم الشان دورانِ سفر نوبت پور کی طرف سے گذرا اور بغرض ملاقات حضرت مولانا شیخ محمد کبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت اس وقت اندرونِ حویلی تشریف رکھتے تھے اور بھُنی ہوئی تیسی تناول فرمارہے تھے۔ جب شاہزادے کی آمد کی خبر سُنی تو پیالہ ہاتھ میں لئے ہوئے باہر تشریف لے آئے اور ملاقات کے بعد تیسی کا پیالہ پیش فرمایا اور کہا بلا تکلف حاضر ہے۔ ایک مصاحب نے جو شاہزادہ کے ساتھ تھا دریافت کیا' کیا ہے؟

آپ نے فرمایا تیسی ہے۔ اُس نے کہا، اگر تکلف کرتے تو کیا کرتے؟ آپ نے فرمایا نمک ڈال دیتے۔ اس بات کا شاہزادے پر ایک خاص تاثر ہوا اور اس نے علاقہ دُگّل بطور جاگیر پیش کیا، حضرت نے نہایت استغنا اور کمال بے تعلقی سے فرمایا فقیر کو جاگیر کی کیا حاجت ہے؟ ایک مرید نے عرض کیا کہ حضور کو نہیں، حضور کے غلاموں کو تو ضرورت ہے۔ حضور قبول فرمالیں اور مجھے بخش دیں، چنانچہ حضرت نے اس جاگیر کو قبول کر کے اُسے عطا فرمادیا۔ حضرت کا یہی مُرید دگّل کے "خان راجہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

اس واقعہ کو حضرت قطب العصر مولانا شاہ محمد علی سملوی فردوسیؒ نے اپنے ایک خط میں جو "مکتوبات محمدی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس طرح لکھا ہے:۔

"حضرت مولانا شیخ کبیر رحمۃ اللہ علیہ مشہور است کہ عظیم الشان شاہزادہ برائے ملاقات آمد، اوشاں آں وقت بخانہ بودند کتاں بریاں می خوردند، چوں خبر تشریف آوری شاہزادہ شنیدند مع پیالہ کتاں بیروں آمدند واز شاہزادہ ملاقات نمودہ پیالہ کتاں را پیش نہادند کہ بلا تکلف پیش نظر است، ندیم کہ شامل شاہزادہ بود گفت کہ چیست؟ فرمودند کہ کتاں است گفت کہ اگر تکلف کردند چہ می ساختند فرمود کہ نمک می انداختم۔"

اِس خط سے اِس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

ذکر ہے کہ ایک مرتبہ اپنے مریدوں کی ملاقات کی غرض سے حضرت مولانا شیخ محمد کبیرؒ دُگّل تشریف لائے اور حسب معمول ایک غریب مُرید کے گھر پر قیام فرمایا۔ خان راجہ کو اپنے غریب رعایا کے گھر پر جا کر شرف ملاقات میں گرانی ہوئی اور رعایا کے گھر پر حاضری سے بچنے کے لئے اپنے علاقہ کا یہ گاؤں "سملہ" جو دُگّل سے دو میل شمال میں واقع ہے، حضرت کو بطور نذر پیش کیا اور وہاں آپ کے قیام و سکونت کا نظم کیا لیکن حضرت نے مستقل طور پر اس گاؤں کو اپنا مسکن نہیں بنایا اور نوبت پور میں ہی مقیم رہے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد، آپ کے پوتے حضرت مولانا شاہ غلام رسول صاحبؒ بن حضرت مولانا شاہ محمد اعظمؒ سملہ تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی، آپ کی ذات سے تقویت پاکر

آپ کے بھائی حضرت مولانا شاہ محمد جاراللہؒ بن حضرت مولانا شاہ محمد اعظمؒ بھی سملہ چلے آئے اور اپنے بزرگ ربزرگوار کے زیر سایہ یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ فی الوقت سملہ میں حضرت مولانا شاہ جاراللہ صاحبؒ ہی کی اولاد آباد ہے [1] کیونکہ حضرت شاہ غلام رسولؒ سے نسب کا اجراء نہ ہوا، حضرت شاہ غلام رسولؒ اور حضرت شاہ جاراللہؒ دونوں بزرگوں کے مزارات سملہ بستی کے آبائی قبرستان میں نالہ پر واقع ہے۔

حضرت مولانا شاہ جاراللہؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ غلام امامؒ اپنے وقت کے صاحبِ علم اور باکمال صوفی تھے۔ آپ حضرت شاہ کمال علی کمال دیوروئیؒ کے خالہ زاد بھائی، شاگرد اور مرید و خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ کمال علیؒ کے وصال کے بعد جب حضرت کمالؒ کے جانشیں کا مسئلہ درپیش ہوا تو حاضرین مریدین اور خلفاء و مجازین حضرت شاہ کمال علیؒ نے بلا اختلاف حضرت مولانا شاہ غلام امام سملویؒ کو منتخب فرمایا مگر آپ نے اپنے شیخ حضرت شاہ کمال علیؒ کی اتباع کی اور جانشینی کو قبول نہیں فرمایا بلکہ حاضرین کے اصرار اور خواہش کو دیکھ کر آپ نے حضرت مولانا شاہ انور علی قدس سرہٗ کو جو حضرت صاحب کے ماموں زاد بہن کے پوتا تھے مرید کیا اور خرقۂ خلافت عطا کر کے شیخ کا جانشیں تسلیم فرمایا۔

حضرت مولانا شاہ انور علی صاحبؒ نے اپنے زمانۂ حیات ہی میں حضرت مولانا شیخنا شاہ شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ (معروف بہ حضرت اعلیٰ) بن مولانا شاہ محمد علی سملویؒ بن مولانا شاہ غلام امام سملویؒ کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا تھا۔ حضرت شاہ انور علی صاحبؒ کی کوئی اولاد نہ تھی آپ نے اپنے سالے حضرت مولانا شاہ محمد ہادی قدس سرہٗ بن حضرت مولانا احمدی

---

[1] یہ خاندان عثمانی حضرت مخدوم برہان الدین عرف شاہ خوندمیاں دیوروی کی اولاد ہے سلسلہ نسب یہ ہے مولانا شاہ جاراللہؒ بن مولوی محمد اعظمؒ بن مولانا شاہ محمد کبیرؒ بن حضرت شاہ معروفؒ بن حضرت شاہ منصور دانش مندؒ بن حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف شاہ خوندمیاںؒ بن حضرت خواجہ برخوردارؒ بن حضرت خواجہ اسحاقؒ بن حضرت خواجہ داؤدؒ بن حضرت خواجہ سلیمانؒ بن حضرت خواجہ عبدالقدوسؒ بن حضرت خواجہ شبلیؒ بن حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتیؒ۔

پھلواروی قدس سرہٗ کی صاحبزادی بی بی وصیت النساء عرف صیبن کو بطور متبنیٰ لے لیا اور ان ہی سے حضرت اعلیٰ مولانا شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ کی شادی فرمادی۔ حضرت اعلیٰ کی تعلیم و تربیت اپنے والد قطب العصر مولانا محمد علی سملویؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی اور آپ کی بیعت بھی اپنے والد ماجد ہی کے دست حق پرست پر اپنے آبائی طریقہ و سلسلہ فردوسیہ[1] میں ہوئی اور تکمیل سلوک بھی اسی مشرب کے مطابق ہوا۔ بعدازاں آپ کے پیر خرقہ حضور پُرنور حضرت شاہ انور علی قدس سرہٗ نے الباس خرقہ کر کے اپنا جانشین فرمایا۔ آپ کو سلسلۂ فردوسیہ، سلسلۂ قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ، سلسلہ شطاریہ وغیرہ کی اجازت اپنے والد بزرگوار ہی سے ہے۔ اس طرح آپ بیک وقت سملہ میں اپنے جد امجد حضرت مولانا شاہ غلام امامؒ اور والد ماجد قطب العصر حضرت مولانا شاہ محمد علی فردوسی سملویؒ کے خلیفہ و مجاز ہیں اور دیورہ میں حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی خانقاہ برہانیہ کمالیہ کے جانشین ہوئے۔

حضرت مولانا شاہ محیب الحق کمالی سملویؒ کی روایت ہے کہ جب حضرت مولانا شاہ غلام امام فردوسیؒ کا آخر وقت ہوا تو وصال سے ایک دو روز پہلے آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت قطب العصر مولانا شاہ محمد علی فردوسی سملویؒ کو بلایا اور کلاہ چہار ترکی صندلی رنگ کی مرحمت فرمائی۔ پھر حضرت قطب العصر نے اپنے چھوٹے صاحبزادے حضرت اعلیٰ الحاج شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید

---

[1] سلسلۃ الذہب نسبت برہانیہ فردوسیہ سہروردیہ یہ ہے: حضرت شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید فردوسیؒ، حضرت مولانا شاہ محمد علی سملویؒ، حضرت مولانا شاہ غلام امام سملویؒ، حضرت مولانا شاہ کمال علی دیوروی، حضرت شاہ غلام ولی دیورویؒ، حضرت شاہ غلام علی دیورویؒ، حضرت شاہ غلام شرف الدین دیورویؒ، حضرت شاہ غلام محی الدین اولیاء دیورویؒ، حضرت شاہ معروف دیورویؒ حضرت شاہ منصور دانش مند دیورویؒ، حضرت شاہ مخدوم برہان الدین عرف خوند میاں دیورویؒ حضرت مخدوم شاہ اسحٰق دیورویؒ، حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ، حضرت مخدوم حسن بن مخدوم حسین نوشہ توحیدؒ، حضرت مخدوم حسین نوشہ توحیدؒ، حضرت مولانا مظفر بلخیؒ حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ۔

قدس سرہٗ کو عطا فرمایا اور حضرت اعلیٰ نے وہ کلاہ اپنے بکس سے نکال کر اپنے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ مجیب الحق کمالی سملویؒ کے سر پر پہنا کر فرمایا " سر پر تو آگیا، خوب ہوا، اِس کو رکھو، تبرک ہے ہر دم پہننے کا نہیں ہے" اِس طرح خانقاہ امامیہ فردوسیہ سملہ کی سجادگی حضرت اعلیٰ کے مجاز و خلیفہ اور بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محمد مجیب الحق کمالی سملویؒ کو حاصل ہوئی۔

حضرت کمالیؒ[1] کے وصال کے بعد یہ تمام تبرکات اور نعمت خاندانی محبوب الاولیا، حضرت الحاج شاہ محمد قاسم فردوسیؒ[2] کو عطا ہوئی اور آپ کے وصال کے بعد موجودہ سجادہ نشیں خانقاہ امامیہ مجیبیہ فردوسیہ سملہ جناب الحاج حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی فردوسی مدظلہ العالی اپنے تمام خاندانی تبرکات کے محافظ اور اپنے بزرگوں کی روش کے مطابق رشد و ہدایت کے مجاز ہیں۔

ع داتا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی خانقاہ بُرہانیہ کمالیہ دیورہ

گیا ضلع میں، شہر گیا سے ۲۰ میل شمال و مغرب میں ایک قصبہ ٹکاری واقع ہے۔ ٹکاری سے چھ میل مغرب میں ایک بہت ہی قدیم بستی حضرت دیورہ کے نام سے موسوم ہے۔ جہاں حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف شاہ خوند میاں، آسودہ ہیں اور ان کی اولاد دیورہ کے علاوہ سملہ، مکارم چک، پیربیگہ میں بھی آباد ہے یہ عثمانی خانوادہ ہے۔ جس کا سلسلۂ نسب حضرت مخدومؒ[3] برہان الدین عرف خوند

---

[1] حضرت کمالیؒ کا وصال ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ کو ہوا۔

[2] آپ کی وفات ۲۹ شعبان ۱۳۶۶ھ کو بوقت ۷ بجے شام ہوئی

[3] سلسلۂ نسب یہ ہے:
حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف بندگی شاہ خوند میاں دیورویؒ بن حضرت خواجہ برخوردارؒ بن حضرت خواجہ اسحاقؒ بن حضرت خواجہ داؤدؒ بن حضرت خواجہ سلیمانؒ بن حضرت خواجہ عبدالقدوسؒ بن حضرت خواجہ شبلیؒ بن حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتیؒ، بن حضرت خواجہ محمودؒ، بن حضرت خواجہ یعقوبؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میاں دیوروئیؒ سے ساتویں پشت میں حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتیؒ سے ملتا ہے۔ اس خانوادہ کو اجازت وخلافت یوں تو تقریباً تمام ہی مشہور سلاسل صوفیہ سے ہیں لیکن خصوصی خاندانی نسبت روحانی سلسلۂ الذہب سلسلۂ فردوسیہ سہروردیہ ہے اور حضرت مخدوم شاہ برہان الدین[۱] دیوروئیؒ سے چھٹی نسبت حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ تک پہنچتی ہے۔

حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف بندگی شاہ خوند میاں دیورویؒ اپنے وقت کے ولی کامل اور صوفی باصفا تھے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے منبع و مخزن تھے۔ آپ کی ذات والاصفات اس پورے علاقہ کے لئے آفتاب رشد و ہدایت تھی۔ آپ کے بعد آپ کی نسبی اور روحانی سلسلے نے ایمان و یقین اور رشد و ہدایت کا یہ چراغ روشن رکھا۔ علم و یقین کی یہ روشنی پھیلتی رہی اور فیوض و برکات جاری رہے۔ آپ کی اولاد میں حضرت شاہ معروفؒ، حضرت شاہ غلام محی الدین اولیاء، حضرت شاہ غلام شرف الدین دیورویؒ حضرت شاہ غلام علی دیورویؒ

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) بن حضرت خواجہ عیسیٰؒ، بن حضرت خواجہ اسمٰعیلؒ، بن حضرت خواجہ محمدؒ بن حضرت خواجہ ابابکرؒ، بن حضرت خواجہ علیؒ، بن حضرت خواجہ عثمانؒ بن حضرت خواجہ عبداللہؒ، بن حضرت خواجہ عبداللہؒ، بن حضرت خواجہ شہاب الدینؒ، بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰن گازرونیؒ، بن حضرت خواجہ عبدالعزیز سرخسیؒ، بن حضرت خواجہ خالدؒ، بن حضرت خواجہ ولیدؒ، بن حضرت عبدالعزیزؒ، بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰنؒ، بن حضرت عبداللہ ثانیؒ، بن حضرت عبدالعزیزؒ بن حضرت عبداللہ کبیرؒ، بن حضرت امیر عمروؒ، بن حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

[۱] سلسلۂ عالیہ فردوسیہ سہروردیہ یہ ہے:

حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف خوند میاں دیورویؒ، حضرت مخدوم شاہ اسحٰق دیورویؒ حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ، حضرت مخدوم حسن بن مخدوم حسین نوشہ توحیدؒ، حضرت حسین نوشۂ توحیدؒ، حضرت مولانا مظفر بلخیؒ، حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ۔

حضرت شاہ غلام ولی دیوروی جیسے آفتاب رشد وہدایت پیدا ہوئے، اور اسی خاندانِ برہانیہ سے حضرت شاہ غلام علی دیوروی کے نواسا حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی جیسے باکمال عالم، شاعر، درویش، اور صوفی پیدا ہوئے۔ جنھیں اپنے نانا حضرت شاہ غلام علی دیوروی سے بیعت شرف اور تعلیم وتربیت حاصل تھی آپ اپنے زمانہ کے ولی کامل اور مشہور ومعروف بزرگ تھے۔ آپ کی ذات بابرکات سے بے شمار علمی وروحانی فیوض وبرکات جاری ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے صاجزادے حضرت شاہ غلام ولی دیوروی زیب سجادہ ہوئے۔ حضرت شاہ غلام ولی کے وصال کے بعد جن کی کوئی اولاد نہ تھی، خلفاء مجازین خانقاہ برہانیہ نے حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کو ان کے کمالات علمی وروحانی کے باعث مسند سجادگی پر بٹھانا چاہا تو آپنے ازراہ انکسار انکار فرمایا اور جب زیادہ اصرار بڑھا تو آپ نے جناب شاہ خادم علی صاحب بن سید شاہ متین پلاسوی کو جو حضرت شاہ غلام ولی کے نواسے اور آپ کے ماموں زاد بہن کے بیٹے تھے، مرید فرمایا۔ اور خرقۂ خلافت دے کر اپنے شیخ ومرشد رحمہم اللہ کا جانشیں اور سجادہ نشیں تسلیم فرمایا۔ حضرت شاہ خادم علیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب بچند واسطہ حضرت شاہ وحیدالدین چلہ کش قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔ حضرت مخدوم وحیدالدین چلہ کش قدس سرہ کی شادی

ہلہ حضرت شاہ خادم علی کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ سید شاہ خادم علیؒ بن سید شاہ متین پلاسویؒ، بن سید شاہ پیر علیؒ بن سید شاہ رحیم اللہ بن سید ملا راضیؒ بن سید شاہ محی الدینؒ بن سید شاہ زندہ بڑےؒ بن سید شاہ میرانؒ بن سید شاہ سالا ہرےؒ بن سید شاہ حسام الدینؒ بن سید شاہ امام الدینؒ بن سید شاہ ابومحمد عرف محمد بہاریؒ بن سید شاہ عبداللہ الملقب بہ سجادہ اکبرؒ بن سید شاہ مخدوم وحیدالدین چلہ کشؒ بن سید علاءالدین جیریؒ بن سید شاہ سلیمانؒ بن سید شاہ سلطان سعیدؒ بن سید حسنؒ بن سید عباسؒ بن سید قاسمؒ بن سید امام علی ہادی نقیؒ بن امام تقی جوادؒ بن امام موسیٰؓ بن امام موسی کاظمؓ بن امام جعفر صادقؓ بن امام محمد باقرؓ بن امام سید زین العابدینؓ بن امام حسین شہید کربلاؓ بن حضرت سیدنا علی مرتضیٰؓ۔

.بی بی بارکہ سے ہوئی تھی جو حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی پوتی تھیں اور خود ولیہ کاملہ تھیں حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کے وصال کے بعد آپ کے خلفاء و مجازین اور مریدین و معتقدین نے حضرت مولانا شاہ غلام امام سملوی فردوسیؒ کو جو حضرت صاحبؒ کے خالہ زاد بھائی شاگرد اور مرید و خلیفہ بھی تھے۔ خانقاہ برہانیہ کا جانشیں بنانا چاہا لیکن آپ نے اپنے پیر طریقت حضرت صاحبؒ کی طرح اس منصب کو قبول نہیں کیا اور حاضرین کا اصرار دیکھ کر حضرت شاہ انور علی صاحبؒ کو جو حضرت شاہ کمال علیؒ کے ماموں زاد بہن کے پوتا تھے مرید کیا اور خرقہٴ خلافت عطا کر کے شیخ کا جانشیں فرمایا۔ حضرت شاہ انور علی صاحبؒ [1] کی کوئی اولاد نہ تھی آپ نے اپنی حیات میں ہی حضرت شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ کو اپنی جگہ خانقاہ برہانیہ کمالیہ کا جانشیں منتخب فرمایا۔ آخر عمر میں آپ نے اپنے منجھلے صاحبزادے حضرت شاہ فدا حسین صاحب قدس سرہٗ العزیز کو خانقاہ برہانیہ کمالیہ کا جانشین اور سجادہ نشیں مقرر فرمایا اور خود اپنے آبائی مکان سملہ میں اپنے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ مجیب کمالی سملویؒ کے پاس آگئے اور وہیں خلوت گزیں ہو گئے اور بتاریخ ، رجب ۱۳۲۵ھ میں اچانک مسجد

---

[1] حضرت شاہ انور علیؒ کا سلسلۂ نسب خاندانِ پھلواری کے جد اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری سے ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے : شاہ انور علیؒ بن مولوی شاہ محمد امینؒ بن مولوی نصیر الدینؒ بن ملّا صبیح الدینؒ بن ملّا فصیح الدینؒ بن بایزیدؒ بن محمد فریدؒ بن امیر محمد حسینؒ بن حضرت امیر عطاء اللہؒ بانی سنگی مسجد پھلواری شریف۔

حضرت شاہ انور علی صاحبؒ کے والد مولوی شاہ محمد امینؒ کی پہلی شادی سے بی بی قادرہ ہوئیں جو شاہ احمد علی بن شاہ خادم علیؒ ساکن پلاسی منسوب ہوئیں اور ان سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں ایک بیٹی بی بی حکیم النساء کی شادی مولانا شاہ محمد علی فردوسی سملویؒ سے ہوئی۔

مولوی شاہ محمد امین بن مولوی نصیر الدینؒ، مولانا شاہ کمال علی کمال دیوروئی کے مرید و خلیفہ تھے اور ان کی دوسری شادی سے حضرت شاہ انور علی دیوروی قدس سرہ تھے۔ آپ کو بیعت اور اجازت و خلافت اور تعلیم و تربیت باطنی، حضرت مولانا شاہ غلام امام سملویؒ سے تھی۔

منڈیر کے گرنے سے شہادت پائی۔ آپ کی مزار مبارک سملہ میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت شاہ فدا حسین فردوسیؒ کے بعد آپ کے چھوٹے صاحبزادے جناب شاہ محمد ابراہیم صاحب فردوسیؒ سجادہ نشین ہوئے اور آپ کی وصال کے بعد موجودہ صاحب سجادہ خانقاہ برہانیہ کمالیہ آپ کے بڑے صاحبزادے برادرِ عزیز مولانا شاہ منصور احمد عثمانی سلمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

باب دوم :

سوانحِ حیات

حضرت شاہ کمال علی کمال رحؒ

۱۱۳۰ھ ——— ۱۲۱۵ھ

۱۷۲۰ء ——— ۱۸۰۳ء

سیاسی، معاشرتی اور دینی پس منظر

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ دیوروی کا عہد اپنے سیاسی، سماجی اور دینی پس منظر کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا بہت ہی نازک دَور رہا ہے۔ مغل دَور کا زوال اور انگریزوں کا عروج یہ دو المناک حادثے ایک ساتھ پیش آرہے تھے۔ دہلی جو کبھی قوت و طاقت کا سرچشمہ اور ملک کے اتحاد و سالمیت کی علامت تھی اُسے آئے دن نت نئی تباہیوں کا سامنا تھا۔ صدیوں کی مسلمان حکومتوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ مغلوں کی اس سالمیت کو ختم کرنے میں جہاں اندرونی طور پر مرہٹے، جاٹ، روہیلے اور سکھوں کا ہاتھ تھا تو کبھی بیرونی حملہ آوروں نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی صورت میں دہلی شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مغل حکومتوں کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ سب سے بڑھ کر انگریز تجارت کی راہ سے اس ملک میں داخل ہو چکے تھے اور تمام دریائی راستوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چپکے چپکے ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں جنھوں نے مغل سلطنت کے زوال کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔

اٹھارہویں صدی کا وسط جو حقیقتاً حضرت کمالؒ کا عہد ہے ہندوستان کی معاشی بدحالی، سماجی ابتری اور سیاسی انتشار و بدنظمی کا ایسا پُرآشوب دَور ہے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، صدیوں کی بنی بنائی اور مستحکم حکومت ختم ہو رہی تھی اُمراء و

سلاطین مارے مارے پھر رہے تھے، شورش پسندوں کا دار دورہ تھا، اس زوال کے اثر سے کوئی محفوظ نہ تھا، اُمراء و روٗساء سے لے کر عوام تک سب ہی پر اس کا بُرا اثر پڑ رہا تھا، اہلِ علم و ہنر اور اہلِ دانش کا کوئی قدر داں نہیں رہا تھا۔ دہلی اہلِ علموں، دانش وروں، ہنروروں اور شاعروں سے خالی ہو گئی تھی۔ اس زوال اور تباہی کا اثر ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑ رہا تھا۔ اس سیاسی، سماجی اور معاشی طوائف الملوکی نے اس دَور کی پوری زندگی کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا اہلِ فکر و دانش کے قلب و ذہن کو اس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس طرح دینی و اخلاقی اور روحانی طور پر بھی پراگندگی اور انتشار کی صورت پیدا ہو چکی تھی اور ذہنی و فکری ہلچل نے فرار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس دورِ زوال میں مغل حکومت حالت جاں کنی میں تھی، بادشاہ اُمراء اور عوام سب ہی کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی تھی۔ عظمتِ ماضی کا احساس ان کے لئے سوہانِ روح ہو گیا تھا اور روز روز کی قتل و غارت گری نے زندگی کا سارا لطف خاک میں مِلا کر رکھ دیا تھا، جینے کے لئے کوئی سہارا چاہئے، ایسے وقت میں اس پریشان حال سماج کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے فرار کا راستہ، فرار کی دو صورتیں نمایاں تھیں، مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی کوشش کی جائے اور مادی دُنیا کی ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لئے عالمِ آخرت کا راستہ اختیار کر کے خانقاہوں میں سکون کی تلاش کی جائے، اور دوسرا راستہ عیش کوشی، جنسی آسودگی اور راگ و رنگ میں دن رات ڈوب کر یک گونہ بےخودی چاہنے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تصوف کو اس عہد میں جتنی عوامی مقبولیت رہی ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی اور مغل بادشاہ اور اُمراء و روٗسا بھی جب حالات کی تاب نہ لا سکے تو غرق مئے ناب ہو گئے۔ اس طرح ایک طرف عوام میں تصوف کی مقبولیت بڑھتی گئی تو دوسری طرف امراء و سلاطین بھی عیش و عشرت کی زندگی کے ساتھ فقیروں اور درویشوں کی عقیدت کے سہارے سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ جب دنیا کی طرف سے مایوسی ہو گئی اور دنیاوی زندگی آنکھوں سے دور ہو گئی پھر لوگوں کو نظارے کے لئے خلوتِ دل کی انجمن ہی رہ گئی۔ اس عہد میں عام طور پر مسلمان اپنی صدیوں کی حکومت کے زوال سے مایوس ہو کر

عملی دنیا میں تو ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے تھے لیکن بے چین روح اور بے قرار دل کی تسکین و تسلّی کے لئے ذہنی و قلبی واردات کا سہارا ڈھونڈا جا رہا تھا اور تصوّف کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ روحانی ارتقا اور قلبی سکون ہی زندگی کی اصل سمجھے جانے لگے تھے۔ جس طرح چنگیزی حملوں نے بغداد کے زوال کے بعد تصوف کی تحریک کو نئی قوت دی تھی اسی طرح مغلوں کی تباہی نے ہندوستانی مسلمانوں کو تصوف ہی کی روحانی تربیت میں نجات کی راہ دکھلائی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا بیان ہے کہ اس دور میں بائیس[۲۲] صاحب نسبت و ارشاد بزرگ ہر طریقے اور سلسلے کے صرف دلّی میں تھے۔ شاہ فخرالدینؒ اور مرزا مظہر جان جاناںؒ کی خانقاہیں رشد و ہدایت کا منبع تھیں اور شاہ ولی اللہؒ نے اسی زمانہ میں تجدید و احیائے دین کی اس زبردست اسلامی تحریک کی داغ بیل ڈالی جو آگے چل کر اسلامی نشاۃ ثانیہ کی محرک بنی۔ ان قابل احترام اور بزرگ ہستیوں نے پورے ملک میں مختلف علاقوں اور خطوں میں اپنے اپنے دائرۂ کار میں مغل بادشاہوں کے پیدا کردہ اس سیاسی، معاشی اور ذہنی و فکری زوال کو روکنے کی پورے خلوص اور ایمان داری سے کوششیں کیں مگر بگاڑ اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور اس وقت پورے ملک خصوصاً دہلی کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے ان اہل دل اہل اللہ کو اپنے اندر کے نظارۂ باطن کے سوا کہیں اور امان کی صورت نظر نہیں آتی تھی، جب دنیا جنگ و جدال کا میدان بن جائے تو اپنے اندر کی دنیا ہی دارالاماں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں دُنیا کی بے ثباتی اور دولت و حکومت کی بے وقعتی کا احساس عام طور پر نظر آتا ہے جس کے نتیجہ میں تصوف ہی عوام و خواص کا مقبول و محبوب مسلک و مشرب بن گیا تھا۔

اٹھارہویں صدی کا نصف جو حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کا عہد ہے اُس پورے عہد کو اگر صوفیاء کا عہد کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ اکثر و بیشتر علماء، شعراء اور اہل علم و دانش فکری و نظری طور پر صوفی بزرگ اور اہل اللہ تھے۔ بہار میں حضرت غلام نقشبندی سجادؒ ۱۱۱۶ھ/۱۱۷۳ھ، حضرت نورالحق تپاں پھلواروی ۱۱۵۶ھ/۱۲۳۳ھ۔ شاہ آیت اللہ جوہری مذاقی ۱۱۲۶/۱۲۱۰ھ۔ شاہ ظہورالحسن ظہور ۱۱۸۵ھ/۱۲۳۴ھ، اور

حضرت شاہ ابوالحسن فرد ۱۱۰۵ھ/۱۲۳۴ھ جہاں ممتاز شاعر تھے ساتھ ہی اپنے وقت کے باکمال صوفیا، میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دہلی میں حضرت مظہر جان جاناں ۱۶۶۸ء/۱۷۸۱ء اور خواجہ میر درد ۱۷۰۹ء/۱۷۸۵ء کا تو وقت کے باکمال اہل اللہ میں شمار ہوتا تھا اور ان کے کلام کی تمام تر بنیاد تصوف و اخلاق ہی پر تھی بلکہ اس دور میں میر تقی میر ۱۷۲۴ء/۱۸۱۰ء، مرزا محمد رفیع سودا ۱۷۱۳ء/۱۷۸۱ء، میر غلام حسن ۱۷۳۶ء اور میر سوز ۱۷۲۰ء/۱۷۹۸ء کے کلام میں بھی تصوف و احسان کی چاشنی ملتی ہے اس طرح حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کا یہ پورا عہد علم و دین، شعر و ادب اور تصوف و اخلاق کا عہد کہا جا سکتا ہے۔

اس پورے عہد میں حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کی شخصیت خواہ وہ رشد و ہدایت کا منصب اور تصوف و اخلاق کی منزل ہو یا علم و دانش اور شعر و ادب کی مسند ہو ہر جگہ اور ہر کہیں ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آسمانِ شعر و شاعری اور تصوف و احسان پر اس دور میں جو سینکڑوں روشن ستارے نمایاں ہوئے اس بھری محفل میں حضرت کمالؔ تنہا ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ستاروں کی اِس جھرمٹ میں آپ "مہر منیر" کی طرح چمکے جس کی کرنوں سے علم و دانش، شعر و ادب اور تصوف و احسان کی ہر وادی روشن و منور ہو گئی۔

حیات حضرت کمالؔ کا ماخذ

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی ریاست بہار کے اس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جو روحانی طور پر حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ سے نسبت رکھتا تھا اور ان کے اصول زندگی "خاک شو گم نام شو" اس پورے خانوادہ کا ہمیشہ مسلک و مشرب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت صاحبؒ جیسا باکمال شاعر، صوفی اور اہل اللہ جن کی مثال اُس دور میں نہیں ملتی اپنی پوری زندگی گمنامی اور خلوت نشینی میں بسر کی۔ آپ کی ذات ستودہ صفات اس لائق تھی کہ آپ کی زندگی کے ایک ایک روشن ورق کو سامنے لایا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ کمال علیؒ جہاں مسند رشد و ہدایت کے نشین تھے تو ساتھ ہی علم و ادب اور بزم شعر و سخن کے صدر نشین بھی تھے۔ لیکن خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کے کتب خانہ میں فارسی، اردو کلام اور چند فارسی خطوط کے قلمی مسودات کے علاوہ

کوئی چیز بھی نہیں ملتی جس سے آپ کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہو۔ آپ کے بعد بھی آپ کے تصنیفات کو جمع و ترتیب کی کبھی کوشش نہیں کی گئی اور نہ کبھی کوئی تذکرہ حیات ہی مرتب ہوا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس خانوادہ میں تذکرہ نگاری اور شخصیت نگاری سے ہمیشہ احتراز برتا گیا اور اس کو نام و نمود اور دنیاوی عزت و شہرت کے حصول کا ذریعہ سمجھا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی روشن حیات پر تاریکی کا دبیز پردہ پڑ کر رہ گیا اور آج علم و ادب کے طالب علموں کو آپ کی زندگی کے سبق آموز واقعات و حالات اور شعر و ادب کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ دورِ جدید میں اس خانوادہ کے ایک بزرگ ہمارے والد ماجد اور شیخ و مرشد محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سلوی ؒ نے جو خود شیخ کامل تھے اور جن کی نگاہ تصوف اور خاندانی بزرگوں کی کتاب پر سب سے زیادہ وسیع تھی۔ ایک قلمی رسالہ "مناقب کمالیہ" کے نام سے مرتب فرمایا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اس سے حضرت صاحب ؒ کے حالاتِ زندگی پر قدرے روشنی پڑتی ہے اور یہ زیادہ تر حالات بھی آپ نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُن سُن کر قلم بند فرمایا۔ خصوصاً اپنے جد امجد اور پیر و مرشد حضرت شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید ؒ سے جو "حضرت اعلیٰ" کے نام سے مشہور تھے۔ پوچھ پوچھ کر زیادہ تر حالات لکھے گئے چنانچہ اسی قلمی مسودہ کے پہلے صفحہ پر حضرت والد محترم ؒ کے اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے ملتے ہیں :-

"یہ زیادہ تر حالات حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ سے دریافت کر کے لکھے گئے ہیں۔ ایک روز حسب معمول جب میں نے حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "لکھ کر کیا کروگے اللہ اللہ کرو۔" اس کے بعد سے پھر دریافت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت اعلیٰ سے میں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں حضرت صاحب ؒ کے حالات لکھ رہا ہوں یا لکھنا چاہتا ہوں مگر بس دریافت کرنے کے بعد قیام گاہ پر آکر روزانہ لکھ لیا کرتا تھا۔"

اس طرح حضرت شاہ کمال علی کمال ؒ کے حالات زندگی پہلی مرتبہ "مناقب کمالیہ[۱]" کے

---

[۱] قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون میں جو معاصر پٹنہ میں چھپا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نام سے جو تقریباً پچیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملوی نے بڑے مطالعہ، تحقیق اور جستجو کے بعد مرتب فرمایا جو اس وقت سوانح حیات کی حد تک ہمارے لئے ماخذ اور بنیاد ہے اسی کی روشنی میں مزید تحقیق و جستجو کے بعد یہ سوانح حیات مرتب کی گئی ہے۔

نام ولقب

نام نامی اسم گرامی "کمال علی" ہے۔ تخلص کمال فرماتے تھے اور "حضرت صاحب" کے لقب سے مشہور آفاق ہیں۔

آباء واجداد

حضرت شاہ کمال علی کمال کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حضرت شاہ فیض علیؒ تھا اور آپ کے جد امجد کا نام میر نصر اللہ عرف میر محمد نصیر خاں تھا جو حضرت مولانا سید شاہ سلیم اللہ گیاریؒ[۱] کے بھائی تھے۔ سادات گیاریں تھے، کیسے بھائی تھے، اس کی تحقیق نہ ہوسکی ہم نسب ضرور تھے۔ حضرت شاہ فیض علیؒ کو علاوہ تبحر علمی کے فن رمل و جفر میں کمال حاصل تھا۔ "فیض الرمل" نامی ایک کتاب بھی نظم میں آپ کی تصنیف ہے۔

حضرت صاحبؒ کا جدی نسب نامہ یہ ہے: حضرت شاہ کمال علی بن شاہ فیض علی گیاری جاجیزی بن میر نصر اللہ عرف میر محمد نصیر خاں بن میر سید حسین بن میر سید محمد بن میر سید آدم فاتح مان پور گیا۔ مرتب "مناقب کمالیہ" لکھتے ہیں کہ میر سید آدم فاتح مان پور کا سلسلہ نسب مجھے نہیں ملا یہ نسب نامہ "فیض الرمل" سے دیکھ کر لکھا گیا ہے یہ مولانا شاہ فیض علیؒ کی تصنیف ہے اور خانقاہ مجیبیہ سملہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

حضرت صاحبؒ کا مادری شجرہ نسب چند واسطوں سے حضرت مخدوم برہان الدین عرف بندگی شاہ خوندمیاں دیوروئیؒ سے ملتا ہے۔ آپ (حضرت صاحبؒ) حضرت مولانا شاہ غلام علی دیورویؒ کے نواسا ہیں۔ آپ کا مادری سلسلہ نسب درج ذیل ہے: ـــ

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) "مناقب کمالیہ" کی نسبت شاہ محمد ابراہیم صاحبؒ سجادہ نشین خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کی جانب کی ہے چوں کہ آپ ہی کے ذریعہ سے ان کو حاصل ہوا تھا اس لئے یہ غلط فہمی ہوئی۔

[۱] گیار فارس کے شہروں میں کوئی شہر ہے۔ جس کی طرف یہ نسبت تھی۔ آپ کی مزار پُر انوار محلہ نادرہ گنج گیا میں لب سڑک واقع ہے۔

حضرت شاہ کمال علیؒ ابن بی بی عـــزیزہ ـــــ بنت حضرت مولانا شاہ غلام علی دیوروی بن شاہ غلام شرف الدینؒ بن شاہ غلام محی الدین اولیاءؒ بن حضرت شاہ معروفؒ بن حضرت شاہ منصور دانش مندؒ بن حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف بندگی شاہ خوندمیاں دیورویؒ بن شاہ خواجہ برخوردارؒ بن شاہ خواجہ اسحاقؒ بن شاہ خواجہ داؤدؒ بن شاہ خواجہ سلیمانؒ بن شاہ خواجہ عبدالقدوسؒ بن شاہ خواجہ شبلیؒ بن حضرت مخدوم محمد جلال الدین کبیرالاولیار پانی پتیؒ، بن حضرت خواجہ محمودؒ بن حضرت خواجہ یعقوبؒ بن حضرت خواجہ عیسیٰؒ بن حضرت خواجہ اسمٰعیلؒ بن حضرت خواجہ محمدؒ بن حضرت خواجہ ابا بکرؒ بن حضرت خواجہ علیؒ بن حضرت خواجہ عثمانؒ بن حضرت خواجہ عبداللہؒ بن حضرت خواجہ شہاب الدینؒ بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰنؒ کاذرونیؒ بن حضرت خواجہ عبدالعزیز سرخسیؒ بن حضرت خواجہ خالدؒ بن حضرت خواجہ ولیدؒ بن حضرت خواجہ عبدالعزیزؒ بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰنؒ بن حضرت عبداللہ ثانیؒ بن حضرت عبدالعزیزؒ بن حضرت عبداللہ کبیرؒ بن حضرت امیر عمروؒ بن حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ۔

وطن اصلی مولانا شاہ فیض علی صاحبؒ کے تین صاحبزادے تھے حضرت شاہ کمال علیؒ شاہ ذوالفقار علی، شاہ کلب علی چند صاحبزادیاں بھی تھیں کتنی تھیں اور کہاں بیاہی گئیں، صحیح حال نہیں معلوم ہوسکا مولانا شاہ فیض علیؒ کا اصلی وطن نادرہ گنج گیا تھا لیکن ان کا مستقل قیام عظیم آباد پٹنہ میں تھا۔ کس سلسلہ میں تھا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا بعض روایت یہ ہے کہ وہ عظیم آباد کے ناظم تھے لیکن اس کی بھی تحقیق نہیں ہوئی۔ ہاں بادشاہ وقت سے کچھ جاگیریں اور معافیاں ضرور ملی تھیں جس کی آمدنی سالانہ ایک لاکھ روپئے سے زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ کمال علیؒ کے دونوں بھائی شاہ ذوالفقار علی اور شاہ کلب علی کا قیام پٹنہ میں رہتا تھا۔ شاہ کمال علیؒ نے ان جاگیروں سے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ سب بھائی بہنوں کو چھوڑ دیا اور یہ دونوں بھائی اس سے مستفید ہوتے تھے اور بڑی شان وشوکت سے پٹنہ میں رہتے تھے اور خود حضرت صاحبؒ اپنے نانا کے مختصر متروکہ پر جو دیورہ، سعدی پور اور پیران پور وغیرہ میں تھا پوری زندگی قناعت کی۔

پیدائش حضرت شاہ کمال علیؒ کی تاریخ پیدائش اور سنہ ولادت کا صحیح سراغ نہیں ملتا اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی پیدائش اپنے ننہال دیورہ میں ہوئی یا نادرہ گنج گیا یا عظیم آباد پٹنہ میں اپنے والد کے پاس ہوئی؟ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ کی پرورش اور ابتدائی تعلیم دیورہ میں اپنے نانا کے پاس ہوئی تھی۔ حضرت اعلیٰ مولانا شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی سنہ ولادت کا پتہ نہیں ملتا مگر جس زمانہ میں مشہور ایرانی شاعر حزیں پٹنہ میں سیاحتاً مقیم تھا اُس وقت حضرت صاحبؒ وہاں پڑھتے تھے اور آپ کی عمر ۱۲ یا ۱۳ سال کی تھی۔" اس اعتبار سے حضرت شاہ کمال علیؒ کی ولادت ۱۱۲۹ھ یا سنہ ۱۱۳۰ھ میں ہوئی ہوگی کیونکہ[۱] حزیں ۱۱۴۲ھ میں پٹنہ آیا ہوا تھا۔ تاریخ پیدائش کہیں نہیں ملتی اِس طرح آپ کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۳۰ھ مطابق سنہ ۱۷۲۰ء متعین ہوتا ہے۔

تعلیم وتربیت حضرت کمالؒ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار ہی سے ہوئی تھی، حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت صاحبؒ بچپن میں زیادہ ذہین وفطین نہ تھے اور حافظہ بھی اچھا نہ تھا۔ ایک دن آپ اپنے ننہال آستانہ برہانیہ دیورہ میں اپنے والد بزرگوار سے " ماقیما " پڑھ رہے تھے اور سبق یاد نہ ہو رہا تھا، آپ کے والد آپ پر کچھ خفا ہوئے، یہ دیکھ کر آپ کے نانا حضرت مولانا شاہ غلام علیؒ نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور اپنا لعاب دہن منہ میں ڈال دیا اس دن سے آپ کا ذہن تیز اور حافظہ قوی ہو گیا۔ اسی کی برکت تھی کہ آپ نے کمسنی ہی میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کرلی تھی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لئے آپ پٹنہ بھیج دیئے گئے۔ پٹنہ میں شاہ عزیزاللہ پلاسوئیؒ کے مدرسہ میں آپ نے تعلیم پائی ملا میر زاہد میرٹھی خصوصی طور پر آپ کی تعلیم کے لئے مدرسہ جایا کرتے تھے۔ پٹنہ میں ملا میر زاہد کی تعلیم کے واقعہ کو حضرت اعلیٰ نے اس طرح بیان

۱؎ مرتب " مناقب کمالیہ " نے حزیں کے پٹنہ آنے کا سنہ ۱۱۴۲ھ لکھا ہے۔ حزیں کے متعلق مزید ان کی تحقیق یہ ہے۔ ولادت حزیں سنہ ۱۱۰۳ھ ہندوستان میں آمد سنہ ۱۱۴۰ھ، پٹنہ میں قیام سنہ ۱۱۴۳ھ، مدت قیام ہند ۱۴ سال۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ ملا میر زاہدؒ صاحب کہیں سے براہ جیٹھولی[۱] آرہے تھے۔ دیورہ درگاہ کے پاس ولی المتقی حضرت شاہ غلام علیؒ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے ملا صاحب سے دریافت فرمایا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے۔ ملا صاحب نے جواب دیا کہ میں پٹنہ جاؤں گا۔ ولی المتقی قدس سرہٗ نے ملا صاحب سے فرمایا کہ میرا نواسا کمال علی شاہ عزیز اللہ کے مدرسہ میں پڑھتا ہے، میں اس کی تعلیم آپکے ذمہ کرتا ہوں، آپ اُسے پڑھا دیں۔ حضرت اعلیٰ فرماتے ہیں کہ ملا صاحب یہ نہ دریافت کر سکے کہ آپ حالتِ ممات میں ہیں یا حالتِ حیات میں۔ جب ملا صاحب مدرسہ میں تشریف لاکر حضرت صاحبؒ سے ملے تو آپ نے اُن سے حضرت ولی المتقی مولانا شاہ غلام علیؒ کی ملاقات اور ان کی ہدایتِ تعلیم کا تذکرہ کیا۔ یہ سُن کر حضرت صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا میرے نانا علیہ الرحمہ کا تو وصال ہو چکا ہے۔ ملا صاحب نے یہ سُن کر فرمایا کہ بہر کیف میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے اور میں اُسے پورا کروں گا۔ اس طرح آپنے ملا میر زاہد پیرتھیؒ علیہ الرحمہ کے زیر تعلیم رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کی۔

جس زمانہ میں آپ پٹنہ میں زیر تعلیم تھے اُس وقت آپ کی عمر ۱۲، ۱۳ برس کی تھی، ان ہی دنوں شیخ علی حزیں خود بیں و خود پرست شاعر وہاں مقیم تھا۔ مولانا شاہ محمد مجیب الحق کمالی سملویؒ فرماتے ہیں کہ جناب مولوی شاہ محمد باقر صاحب مرحوم (جو بیربگیہ گیا کے باکمال شاعر اور اہلِ علم گذرے ہیں جن کی دیوان باقر شائع ہو چکی ہے) کی روایت ہے کہ حزیں ایک خود بیں شاعر تھا۔ عام طور پر وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوتا تھا، ایک دن حضرت صاحبؒ نے اپنی جماعت کے چند طلباء سے یہ اظہار خیال فرمایا کہ آج حزیں سے گفتگو کرنی چاہئے اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ اس کے پاس جاکر جیسا میں کہوں، ویسا ہی آپ لوگ کریں۔ طلباء نے آپ کے اس مشورہ کو مان لیا۔ حضرت صاحبؒ اپنی جماعت کے ساتھ حزیں کے یہاں روانہ ہوئے۔ حُسنِ اتفاق سے وہ ایک کھٹولے پر لیٹا تھا جس کا سرہانہ شمال کی طرف تھا۔ پہنچتے ہی آپ نے فرمایا "السلام علیکم"۔ حزیں نے جواب نہیں دیا۔ آپ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ساتھیوں سے فرمایا کہ میری اقتدا کرو اور پھر آپ نے جنازہ کی نماز پڑھ دی۔ حزیں نے کہا "ایں چہ کردی؟" حضرت

---

[۱] جیٹھلی درگاہ یعنی مزار حضرت پیر جگ جوت قدس سرہٗ

صاحبؒ نے جواب دیا" من سنت پیش کردم، تو واجب ادا نہ کردی، دانستم کہ مُردہ ہستی، نماز گذاردم"۔ حضرت صاحبؒ کے اس جواب پر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور حضرت صاحبؒ کا دست مبارک پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ اس کے بعد دونوں میں نظم میں مکالمہ ہوا۔ وہ مکالمہ افسوس کہ مرتب "مناقب کمالیہ" کو نہ مل سکا۔ وہ فرماتے ہیں کہ شاید مولوی باقر صاحب مرحوم کے صاجزادے مولوی عطا حسین انجینیر ریاست حیدر آباد کے پاس محفوظ ہو۔ اس لئے کہ مولوی صاحب مرحوم نے اس مکالمہ کو قلم بند فرمالیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ تعلیم حضرت صاحبؒ اور حزیںؔ سے متعدد مکالمے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے ایک مکالمہ کا ذکر شادؔ عظیم آبادی نے بھی کیا ہے اور ایک مکالمہ کا حال جناب مولوی شاہ حبیب الحق صاحب سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ نے بھی بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ جناب مولانا شاہ محمد قمرالدین قادری پھلواروی اور جناب مولانا شاہ محمد فردوسی سملویؒ شاہ صاحب موصوف کی خدمت میں تشریف لے گئے، عندالتذکرہ حضرت صاحب علیہ رحمہ کا ذکر آ گیا۔ جناب شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ کی روایت سے حضرت صاحب اور حزیںؔ کی ملاقات اور مکالمہ کا ذکر کیا، چنانچہ جناب مولانا شاہ محمد قمرالدین صاحب قادری پھلواروی نے اِس مکالمہ کو اُسی وقت قلم بند فرمالیا جو حسب ذیل ہے:۔

"علی حزیںؔ در شہرِ عظیم آباد بر سرِ فصیل دندان، ہر دو پا دراز کردہ بہ شان تکبر نشستہ بود حضرت مولانا شاہ کمال علی دیوروی قدس سرہ گلیم پوشیدہ ملاقات فرمودند، علی حزیںؔ گفت بہ شان خاص از کہ پرسم؟ حضرت صاحب فرمودند از کمال علی باز گفت از کجا پرسم در جواب فرمودند از جنت بنگالہ باز گفت بہ چہ آمدی؟ حضرت صاحب فرمودند از ارثِ پدری او گفت "او باغوائے شیطان آمد" جواب فرمودند "من ہدایتِ گمراہاں آمدم" علی حزیںؔ ساکت شد و خادم خود را بایں طور ندا کرد "رمضانی اخگر بیار و بدار بر چلیم ما حضرت صاحب فرمودند بشرطیکہ نہ سوزد گلیم ما" بعد ازاں بر قیام گاہ مراجعت نمودند۔"

بروز یکشنبہ ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۷۴ھ بموقع عرس حضرت میاں صاحب قدس سرہ جناب شاہ حبیب الحق صاحب سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ از والد

بزرگوار خود شنیدہ براستفسار احقر محمد قمرالدین قادری بیان فرمودند جناب مکرم شاہ محمد صاحب سلوی درآں ساعت موجود بودند۔"

مدرسہ عزیزیہ پٹنہ سے آپ نے درس نظامیہ کی تکمیل کی اور وہاں سے فراغت کے بعد آپ حضرت مولانا عبدالعلی بحرالعلوم لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بھی کسب کمال فرمایا۔ جناب سید امین احمد ساکن موضع ردہائی ضلع گیا فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سُنا ہے کہ جب حضرت صاحبؒ مولانا بحرالعلوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور میں کتاب کھولی تو ایک دو سبق کے بعد حضرت بحرالعلوم نے آپ کی کتاب بند کردی اور فرمایا کہ آپ کو کتاب پڑھنے کی حاجت نہیں آپ تشریف لے جائیں۔ حضرت صاحبؒ اور مولانا بحرالعلوم میں نہایت ہی عقیدت مندانہ اور گہرے مراسم استادی و شاگردی کے تھے۔ اس کا اندازہ حضرت صاحبؒ کے اُس مکتوب سے ہوتا ہے جو آپ نے بحرالعلومؒ کو لکھا ہے، خط کا اقتباس وانتخاب آپ کی تصنیفات وتالیفات کے ذکر میں آئے گا۔

اس طرح مختلف اہل علموں کے زیر تعلیم آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل فرمائی۔ آپ کا شمار ملک کے علمائے اجلہ اور فضلائے کبار میں ہوتا تھا، شریعت و طریقت میں آپ ایسا علم راسخ رکھتے تھے کہ علمائے عہد اور مشائخ وقت میں سے کسی کو بھی آپ کے سامنے جرأتِ اظہار نہ ہوتی تھی اور نہ آپ کے قول و فعل پر کوئی نکتہ چینی کر سکتا تھا۔ تمام عمر تعلیم و تدریس اور طالبان علم و دین کی خدمت میں بسر کی۔

شاعرانہ ماحول حضرت شاہ کمال علی کمالؒ بچپن ہی سے علم و ادب کے ماحول اور عظیم آباد کے شعر و سخن کی محفل میں رہے۔ ابتدائی طالب علمی کا زمانہ علمی و ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں گذرا۔ عظیم آباد کے شعر و ادبی ماحول نے آپ کے اندر کی فطری ادبی و شعری صلاحیتوں کو اُبھارا اور پروان چڑھایا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دورِ شباب کے ابتدائی ایام آپ نے اپنے خاندانی دولت و وجاہت کے ساتھ عظیم آباد میں گذارے۔ جس سے آپ کو اپنی ادبی و شعری صلاحیتوں کو اُبھارنے کا زیادہ موقع ملا۔ اس سلسلہ میں شاہ کمال علیؒ اور گورنر جنرل سے تعلقات کی حکایت، تاریخی اعتبار سے کمزور سہی اس بات کی ضرور دلیل ہے کہ

حضرت صاحبؒ نے اپنے ایام شباب کا کچھ حصّہ اپنے خاندانی دولت کدہ میں گذارا، واقعہ یہ ہے، شاہ کمال علی صاحبؒ کا شباب کا زمانہ تھا اور اپنے دیوان خانے میں بیٹھے تھے کہ حضرت سے ملنے کے لئے نواب کاظم علی خاں آئے۔ نواب کاظم علی خاں نے کہا کہ سُنا ہے کہ گورنر جنرل کلکتہ سے مونگیر آئے ہوئے ہیں۔ اگر حضرت کو فرصت ہو تو اس سے ملنے کو مونگیر چلیں۔ حضرت ذرا خاموش ہو گئے کہ فوراً ہی ایک شتر سوار پھاٹک کے اندر داخل ہوا اور ایک بڑا لفافہ خادم نے اس کے ہاتھ سے لے کر حضرت کو دیا۔ لفافہ کھول کر حضرت نے پڑھ کر نواب صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ من جانب گورنر جنرل بنگالہ بخدمت شریف جناب شاہ کمال علی صاحبؒ بعد سلام وشوق ملاقات واضح ہو کہ ان دنوں میں مونگیر میں بضرورت آیا ہوا ہوں۔ عظیم آباد بہت قریب ہے آپ کی زیارت کو آنا چاہتا ہوں، آپ ابھی عظیم آباد ہی تشریف رکھیں گے یا اپنے علاقے کے پرگنوں ملکی بلیا میں جو مونگیر کے ضلع میں واقع ہیں آنے والے ہیں اگر اس طرف آنے کا مقصد رکھتے ہیں تو میں نہ آؤں۔ حضرت نے اسی وقت منشی کو بُلوا کر جواب لکھوایا کہ میں عظیم آباد میں ہوں اور ابھی کہیں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ نواب کاظم علی خاں جو حضرت سے خوب واقف تھے، کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر شاد عظیم آبادی نے بھی کیا ہے اور "مناقب کمالیہ" میں بھی موجود ہے۔ مرتب "مناقب کمالیہ" کہتے ہیں کہ اس کا ماخذ ہمایوں مرزا مرحوم کا ایک خط ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی سند نہیں اور نہ دیورہ میں گورنر جنرل اور شاہ کمال علی صاحبؒ کے تعلقات کی کوئی سند ملتی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اس واقعہ کی تاریخی حیثیت پر اپنے شبہ کا اظہار کیا ہے۔

صوفیانہ رجحان

حضرت شاہ کمال علیؒ کی نانہال چونکہ مشہور صوفی خانوادہ تھا اور آپ کے نانا خود بڑے کامل ولی اور اہلِ دل بزرگ تھے، آپ بچپن ہی سے اپنے نانا کی تعلیم وتربیت میں رہے اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے اس کا اثر آپ کی زندگی پر بڑا گہرا پڑا۔ اگر ایک طرف آپ کو شعر وسخن اور علم وادب سے گہرا لگاؤ تھا تو ساتھ ہی تصوف کے اثر علم ظاہری وباطنی کے شغف اور کاملین وقت کے

فیض صحبت سے آپ خود ولی کامل ہوئے اور پوری زندگی اپنے نانا اور پیر و مرشد مولانا شاہ غلام علی دیوروی کے آستانہ بُرہانیہ پر اپنے خاندانی دولت وثروت سے بے نیاز ہوکر فقر و درویشی اور قناعت کے ساتھ گذار دی۔

تصنیف وتالیف

حضرت شاہ کمال علیؒ ایک صاحب علم وفضل بزرگ اور باکمال تھے آپ کے اردو کلام کا ایک مجموعہ "کلیاتِ کمال" اور ایک طویل اردو مثنوی، اردو شاعری میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اردو غزل اور مثنوی کا جائزہ دو علیحدہ مستقل ابواب میں انشاء اللہ آئندہ تفصیل سے لیا جائے گا جو اس تحقیقی مقالہ کا اصل موضوع ہے۔ اس مطالعہ سے اردو شاعری کی دنیا میں آپ کا مرتبہ و مقام متعین ہو سکے گا۔

فارسی نثر و نظم میں بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ فارسی زبان کے آپ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار تھے اور فارسی نظم میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا آپ کی تصانیف سے آپ کے علمی مرتبہ و مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت صاحبؒ کی تمام تصنیفات ہنوز قلمی ہیں اور خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ میں موجود ہیں۔ مولانا شاہ محمد مجیب الحق کمالی سملویؒ کو حضرت صاحبؒ سے جہاں روحانی تعلق تھا وہیں وہ آپ کے فیض علمی وشعری سے براہِ راست مستفید ہوئے تھے اور اسی تعلق کی بنا پر اپنا تخلص کمالیؔ فرماتے تھے۔ آپ حضرت صاحبؒ کے کلام اور تصنیفات کو مرتب اور شائع کرنے کا ارادہ فرما چکے تھے مگر افسوس کہ حیات نے وفا نہ کی اور یہ کام نہ ہو سکا۔ آپ نے قطب العصر حضرت مولانا شاہ محمد علی فردوسی سملویؒ کے مکاتیب نکاتِ سرمدی معروف بہ مکتوباتِ محمدی کے نام سے مرتب فرما کر شائع فرمایا تھا۔ جس کے آخری صفحہ پر حضرت صاحبؒ کی تصنیفات کا اشتہار بھی درج فرمایا تھا جس سے آپ کے آیندہ کے کام کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت صاحبؒ کی تصنیفات نثر و نظم کسی خاص نام سے موسوم نہیں تھے۔ تمام تصانیف کے نام مولانا شاہ محمد مجیب الحق کمالیؒ کے موسوم فرمودہ ہیں۔ درج ذیل تصنیفات کے اسمار اسی کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں۔

آپ کی چند تصانیف فارسی نظم میں ہیں، فن تصوف پر ایک مثنوی بہ زبان فارسی

"آئینہ کمال" کے نام سے موسوم ہے۔ ایک ترجیع بند فارسی میں "گنجینۂ کمال" کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ "خزینۂ کمال" فارسی غزلوں اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔

فارسی نثر میں بھی کچھ مضامین اور مکاتیب ملتے ہیں۔ توحید جیسے مشکل موضوع پر آپ کا ایک مضمون ہے۔ اہل علم اور صاحب نظر حضرات ملاحظہ فرمائیں کہ آپ نے کس طرح ایک دقیق اور باریک مسئلہ کو عام فہم اور سلیس عبارت میں بیان فرمایا ہے:

"اقتباس بر مسئلہ وحدۃ الوجود"

"بدانکہ انسان کہ حیوان ناطق است و ناطق بمعنی مدرک جزئی و کلی است و مدرک شدن ہم صفت است پس ہرگاہ ازیں صفت قطع نظر کنم فقط حیوان می ماند، وحیوان بمعنی جسم نامی حساس ومتحرک بالارادہ است ونمو کردن واحساس نمودن ومتحرک شدن ہم صفت است۔ پس ہرگاہ کہ ازیں صفت قطع نظر کنم، فقط جسم می ماند وجسم بمعنی جوہر است کہ قابل ابعاد ثلثہ یعنی طول وعرض وعمق بود وقابل ابعاد ثلثہ شدن ہم صفت است پس ہرگاہ ازیں صفت قطع نظر کنم فقط ذات واحد می ماند فَحَصَلَ المقصود کہ درخارج بجز واحد حقیقی دیگر موجود ومحسوس نیست وسائر ممکنات ومحسوسات ودرعالم شہادت از ظہور آثار ولوازم آثار اوست، سبحان تعالیٰ لا موجود اِلّا اللّٰہ ولا مقصود اِلّا اللّٰہ من ھٰذا التالیف ولا اثبات الا اللّٰہ وکلام شیخ محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ در فصوص الحکم نیز شعر بریں معنی است کہ الحقُ محسوس، والخلقُ معقول یعنی آنچہ محسوس است، حق است سبحانہ تعالیٰ وخلق در تعقل است چہ از لوازم آثار وصف اوست حق سبحانہ تعالیٰ وشانہ۔"

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ انسان حیوان ناطق کو کہتے ہیں اور ناطق ہر جزئی و کلی و اصل و فرع کے جاننے والے کو۔ اس اعتبار سے شان ناطقیت بھی انسان کے لیے ایک صفت ہے۔ پس جس وقت ہم انسان (یعنی حیوان ناطق) کی اس صفت سے

انسان کو علیحدہ فرض کرلیں تو انسان (یعنی حیوان ناطق) محض حیوان رہ جاتا ہے اور حیوان ہر اس جاندار اور ذی روح کو کہتے ہیں جس میں نمو کرنے (بڑھنے) احساس کرنے (دریافت کرنے) اور بالارادہ حرکت کرنے کی قوت ہو تو جس وقت ہم حیوان کے بڑھنے حس کرنے اور قصداً نقل و حرکت کرنے کی قوت و صفت مجموعی سے حیوان کو علیحدہ فرض کر لیتے ہیں تو حیوان محض جسم رہ جاتا ہے۔ اور جسم کہتے ہیں ہر اس جوہر کو جو قابل ابعاد ثلثہ ہو یعنی طول، عرض، عمق کا پایا جانا بھی جوہر کے لئے ایک صفت ہے تو جس وقت ہم جوہر کو اس صفت سے یعنی قابل ابعاد ثلثہ ہونے سے علیحدہ فرض کرلیں تو محض جوہر رہ جاتا ہے یعنی ذات باری۔ پس مقصود حاصل ہو گیا کہ خارج ذہن یا دنیا و دین و تمامی عالم محسوسہ و ممکنہ کوئی شئے بھی سوائے واحد حقیقی یعنی خدائے عز و جل کے نہیں ہے اور تمام اشیائے ممکنہ و محسوسہ اسی خدا کی خدائیت کی شاہد یا اس کے حقیقت واحدہ و شان وحدۃ الوجودی و عینیت خاص کی نشانیاں و علامتیں ہیں اور نہیں ہے کوئی شخص بذات خاص موجود مگر اللہ اور نہیں مقصود ہے۔ اس تالیف و عبارت محررہ بالا سے اور اثبات یعنی دلائل و الفاظ و تمثیلات سے مگر اللہ اور کلام شیخ محی الدین عربی کا بھی یہی مفہوم ہے کہ الحق محسوس، والخلق معقول یعنی جو چیز کہ محسوس ہوتی ہے اور ظاہر و باہر ہر شئے میں ہے وہ خدا ہے اور خلق یعنی مخلوق و کل اشیائے ممکنہ و مخلوقہ تعقل میں ہیں یعنی اس کی خالقیت کی شاہد و ربوبیت کی صنعت و نشانیاں۔

مکتوب حضرت شاہ کمال علی کمالؒ

بنام

حضرت مولانا بحر العلوم لکھنوی قدس سرہٗ

فارسی نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ آپ کے مکاتب ہیں۔ ان مکاتیب کو مولانا شاہ محمد امین فردوسی پھلواروی نے "فاتح الانشاء" کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ کمال علیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ میرے "عقیدت آگیں" اور "ارادت کیش" تلامذہ سے ہیں۔ مرتب "مناقب کمالیہ" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت شاہ انور علی صاحبؒ کے والد اور

اور مولانا شاہ نصیر الدین پھلواروی کے بیٹے اور زوجہ شاہ کمال علیؒ کے بھانجے تھے۔ حضرت صاحبؒ سے انہیں صرف تلمذ ہی نہ تھا بلکہ وہ ان کے تعلیم یافتہ، مرتب یافتہ، مرید و مجاز و خلیفہ بھی تھے۔ یہ فارسی خطوط جو زیادہ تر والیان صوبہ اور ناظمین پرگنہ جات کے نام لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک مکتوب جو حضرت بحر العلوم مولانا عبد العلی صاحب لکھنویؒ کے نام ہے، لائق ملاحظہ ہے:

"فخر حکمائے اہل صناعۂ نظریہ نصیحہ سویہ بہ شرف رؤسائے حکمت فلسفیہ اشراقیہ ایبہ اسطرلاب سنج اطباق سموٰت ملکوت، ناخدائے کشتی نشینان ہفت دریائے جبروت، قبلہ محققان ارباب طریقت، کعبہ مذقفان اصحاب حقیقت، خاتم صاحب تہذیب الاخلاق، یعنی فتوت پیرائے زیب مصداق مولوی عبد العلی مدظلہ العالی یکے از آئینہ داران حیرت ولی مشت خاکستر فقیر کمال علی پس از آداب تلمیذانہ و خاک سی آں آستانہ ہدایت نشانہ مقتبسان آنجناب خورشید رکاب می گرداند کہ لالہ بیچو سنگھ جی در شاگرداں ایں فقیر مجمع الحسنات اکثر بلکہ در مکارم اخلاق بے نظیر و از شدت غلبہ مروت وسعی بکار رہا راجہ بلبھدر سنگھ از اقربائے قریب اند قبول کردہ قدم رنجہ بآں صواب فرمودند باز از کمال خوبیہائے خود یک عالم دوستاں بے ریا و مخلصان با صفا را در محن مصائب مفارقت رنج و نوائب مہاجرت و خود ہم از اندیشہ خستہ حالی دردمند و شکستہ بالی مستمند آں سخن بیتاب و دل دیدہ آب ریز خوں ناب مجبور و مبتلا گردیدند ازیں معنی نامہ مشتمل بر مقدمہ معلومہ بہ نہج کہ باعث جمعیت فقیراں بود و سبب طمانیت گوشہ گیران بہ نواب گورنر جنرل نگارش یافتہ است۔ اگر بوسیلہ کہ از اہل فراست و صاحب جسارت ابلاغ خواہد داشت۔ محکم کہ ثنائے محمدت آں حلقۂ ارباب فتوت و مروت بر قلعۂ کوہ قاف شہرت خواہم افراست

۱؎ اس خط پر قاضی عبد الودود جس کا درج ذیل نوٹ قابل مطالعہ ہے۔

زیادہ عریضہ والدعا، الٰہی آفتاب افاضت وافادت آں فیض گستر علامہ بر مفارق عالمیان الی یوم التناد وضیا گستر دارد بالنبی الامیؑ وعترۃ الاسجاد اللہ بس باقی ہوس ۔ "

ترجمہ: حکمائے صناعیہ وعلمائے مسائل نظریہ کے فخر! اور سرداران حکمت فلسفہ اشراقیہ الٰہیہ کے شرف، طبقات ملکوت السموات کو اسطرلاب بنانے والے اہل کشتی دریائے جبروت کے ناخدا! ارباب طریقت کے قبلہ اصحاب حقیقت کے کعبہ! مراسم تہذیب واخلاق کے ختم کرنے والے اور درست ومناسب فتویٰ حق دینے والے، مولوی عبدالعلی مدظلہ العالی کی خدمت خورشید طلعت میں ایک متمنی دیدار فرحت آثار اور مضطرب وحیران ایک کف خاک سوختہ یعنی خستہ وسوزاں فقیر کمال علی بجدادا کرنے مراسم تلمیذانہ وتمنائے خاک بوسی آستانہ ہدایت نشانہ جناب خورشید رکاب کے حضور میں عرض پرداز ہے کہ لالہ بیچو سنگھ جی اس فقیر کے شاگردوں میں نہایت خلیق ونیک ہیں یہ اپنے جذبہ مروت کے غلبہ سے اور نیز مہاراجہ بلبھدر سنگھ کی سعی سے مجبور ومغلوب ہو کر جوان کے قریبی قرابت مند ہیں، یہ مناسب سمجھا اور تشریف لائے اور اپنے اور اپنی خوبیوں اور اخلاق شریفانہ کے باعث ایک عالَم کو اپنا بے رہا اور مخلص دوست بنا لیا لیکن حوادثات زمانہ کے باعث سخت پریشان ومتفکر ہیں اور انواع واقسام کے افکار وآلام میں مبتلا بنا بریں یہ عریضہ اسباب وجوہ مذکورہ معلومہ بالا کے نواب گورنر کی خدمت میں لکھا گیا ہے تاکہ ان کے اضطراب کے لئے باعث طمانیت ہو اور ان کے انتشار وگوشہ نشینی کے لئے وجہ جمعیت ہو اگر کسی باہمت، لائق اور ذہین وہشیار شخص کے ذریعہ مضامین عریضہ ھذا سے اور ان کی شکستہ حالیوں وپریشانیوں سے خبردار ومطلع کرا دیا گیا تو یہ بے چارے اور ہم جناب کے خلق محمدی کا علم اور زہدومروت کا پرچم کوہ قاف شہرت کے قلعہ پر نصب وقائم کریں گے۔ زیادہ دعا۔

" خداوند کریم جناب جیسے بافیض وباکرم کی فیض گستری کو اور آپ جیسے علامہ

عصر کے ظل مبارک کو اہل عالم کے سروں پر تا قیامت نبی امیؐ اور ان کے فضائل کے صدقہ میں قائم و دائم رکھے ۔"

مندرجہ بالا مضمون و مکتوب سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ کمال علی کمالؒ اپنے وقت کے ذی علم و صاحب وجاہت بزرگ تھے ۔ عربی[۱] و فارسی زبان کے ادیب یگانہ تھے ہی، فلسفہ و الہیات میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا ۔ بڑے بڑے علماء و فلاسفر آپ کے شاگرد تھے ۔ مولوی گلزار علی بنارسی جو اپنے وقت کے بڑے ریاضی داں اور فلسفی تھے حضرت صاحبؒ کے شاگرد تھے ۔ اثبات ذات الوجود میں ڈھائی دلائل حکیم ارسطو کے مشہور ہیں ۔ علامہ دوانی نے ارسطو کی ڈھائی دلیلوں کو پورا کر کے تین کیا ۔ علامہ غیاث الدین شیرازی نے چھ دلائل اور بڑھائے ہیں ۔ حضرت شاہ کمال علیؒ نے اپنی تصنیف " کمال الحکمۃ " میں ارسطو کی ڈھائی دلیلوں کو اٹھارہ کیا ہے ۔ اُس دور کے تمام ہی علماء و حکماء نے آپ کے مرتبہ علمی اور حکمت کو سند مانا ہے ۔

نمونہ فارسی کلام حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کے فارسی شاعری کے معیار و مرتبہ کو جاننے اور پہچاننے کے لئے آپ کے فارسیؔ کلام پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے ۔ آپ کی فارسی مثنوی موسوم بہ " آئینہ کمال " کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

الٰہی موج خوں بر مشت گل ریز	خدنگ سیلے بداغستان دل ریز
طپیدن العطش زد ، در بر دل	رواں کن آب تیغ بر سر دل
ز سوزِ عشق آتش در سرم زن	شرر ہا کن بر پروانہ من
نگہ فانوس شمع نالہ پرواز	بچشم مردمک آتش نشیں ساز
پس از دل مردگی بوئے وطن دہ	چو صبح از زخم ناسورم کفن دہ

۱؎ حضرت کمالؒ کے عربی قصاید پر قاضی عبدالودود کا ایک مضمون معاصر پٹنہ میں شائع ہو چکا ہے ۔ اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس پایہ کے عربی کے شاعر تھے ۔ اُس پر تفصیلی گفتگو اس مقالہ کے موضوع سے باہر ہے ۔

الٰہی شام دیجورم سحر کن | گل خورشید این داغِ جگر کن
الٰہی از تو خواہم نعمتے چند | قیامت سایہ پرور آفتے چند
چہ آفتہا کہ آتش خانۂ راز | بذوق سوختہا گرم پرواز
شکستن خانہ زاد چیز دل | صدا یعنی بپائے او سلاسل
ز موج اشک حسرت نیش زنبور | نگہ در دیدہ آہ زخم ناسور
نفس الماس یاقوت دل ریش | شرر در چشم ناسور از شب خویش
دلم چوں شد تمنّاے تو دارد | نفس ز نجیر سودائے تو دارد
دل از سر بستگی چوں خم بجوش است | ز آب و رنگ حسرت مے فروش است
دل از افسردگی چوں خوشہ درماند | کہ دہقاں بر سرم خاک ترا فشاند
دل از آوارگی خوش باد یا شد | روائے ابر بر دوش ہوا شد
الٰہی اضطرابم را فزوں کن | بشیشم برق خرمن سرنگوں کن
الٰہی غرق سیل رحمتم کن | بلند از کوہ گردوں ہمتم کن
الٰہی آتش افگن در سر من | کہ گیرد شعلہ یکسر پیکر من
الٰہی رحم کن بر زاری من | نہ آمد از کسے غم خواریِ من

فارسی کلام میں آپ کا ایک ترجیع بند موسوم بہ "گنجینۂ کمال" بھی ہے۔ اس کے اول، آخر کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ما دیوانۂ گلستانیم | عندلیب بہار جانانیم
از نسیم خیال زلف کسے | یک چمن آہ سنبلستانیم
اے صبا نگہتے زراں کاکل | زیں ہوا موبمو پریشانیم
دیر و کعبہ بہ پیش ما شکند | کفر و اسلام ما نمی دانیم
آہ بر پائے رہروان ترش | ایں سخن گفتہ جاں بیفشانیم
ہمہ دانند رہنما عشق است | ایں نہ دانند مدعا عشق است

لعل او نکتہ برہمن گیرد — حرف او نکتہ بر ختن گیرد
ہر کہ در وادی طلب گم شد — مشکل است او رہِ وطن گیرد
کشتۂ عشق را ز خوں گرمی — آتشِ داغ در کفن گیرد
آہ ایں مطلع بلند کمال — درِ افلاک بے سخن گیرد
ہمہ دانند رہنما عشق است
ایں نہ دانند مدعا عشق است

فارسی کلیات موسوم بہ "خزینۂ کمال" سے چند غزلیں اور چند رباعیات پیشِ خدمت ہیں، اہلِ فن اور صاحبِ ذوق حضرات محظوظ و مسرور ہوں ؎

پاک است روح وحشی از خود رمیدہ را — بوئے گلست مایہ نسیم وزیدہ را
اے آشنائے بحر بہ بیگانہ رو مکن — خاک است رزق موجۂ ساحل رسیدہ را
دل را بعشق دادہ طلب می کنی عبث — کس باز پس نداد متاع خریدہ را
شیخ از فسون دلبری او چہ واقف است — حرفیست سحر نرگس جادو ندیدہ را
ناخن شکستہ در گرہ نافہ پیچ اش — یک رہ چو شانہ زلف سمن سا کشیدہ را
ساقی بیار بادہ چرا دیر کردۂ — مینا ز شمع کم نبود بزم چیدہ را
خاموشی است شیوہ و اصل کمال من
گم گشتہ شور سیلِ بدریا رسیدہ را

سینہ گو چاک شود نالہ کشیدن ندہم — دیدہ گو خون شود رشک چکیدن ندہم
گر شود دیدۂ جبریل چو یعقوب سفید — بوئے پیراہنِ جانانہ شمیدن ندہم
گر طبیب عیسیٔ وقت است چہ اعجاز کند — یعنی از پہلوئے دل درد توچیدن ندہم
گر شود دستِ قضا پنبہ نہ ناسورم — نیز غم از جگر خستہ کشیدن ندہم
شوقم از شر قلندر زدہ صد جوش کمال
تا نہ بینم رُخِ او روح رمیدن ندہم

سوزد بہ نیم خندہ دلِ سلسبیل را | ریزد بہ نیم غم زدہ پر جبریل را
آہم کشد بدیدۂ خورشید میل را | سوز سرشک داغ کند رود نیل را
بر محورِ عشق شیخ مزن آتشِ غضب | نمرود سوختن نتواند خلیل را
آمادۂ سفر شدہ این کاروانِ عمر | بر بستہ رخت و بر زدہ طبلِ رحیل را
چون غنچۂ شگفتہ بناشد فسردہ او | مشت زراست در گرۂ دلِ بخیل را
اے بوالہوس تو دامنِ عشقش زکف مدہ | عزّت بجز جنوں ندہد کس ذلیل را

مردار می شود چو زحد رفت فربہی
کز بس بدست بوئے عرق مست پیل را

رباعیات در منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

باشد محال عقل بیانِ تو یا علیؓ | ذات خدا است خاص مکانِ تو یا علیؓ
بر بندۂ شکستہ دلِ ہجر یک نظر | پیداست شانِ حق زنشانِ تو یا علیؓ

عالی بود جناب تو یا مرتضیٰ علیؓ | جبریل در رکاب تو یا مرتضیٰ علیؓ
یک پنجہ بر فراق کہ کس جو رمی کند | شیرِ خدا خطاب تو یا مرتضیٰ علیؓ

روح القدس در در رکاب تو یا علیؓ | عالم پناہ است جناب تو یا علیؓ
مارا ز قیدِ سلسلۂ ہجر وا رہان | بے شبہ لافتاست خطاب تو یا علیؓ

یا علیؓ از الم پناہم دہ | سینہ خوں شد زغم پناہم دہ
آہ از تیغِ تیر ہجر کسے | بسمل از ستم پناہم دہ

تعلیم باطنی اور بیعت و خلافت

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ مولانا بحر العلوم

لکھنویؒ کے علوم ظاہری اور فیوض باطنی سے مستفید و فیض یاب ہو کر آستانہ مخدوم الملک بہار تشریف لائے اور ایک چلّہ یہاں قیام فرمانے کے بعد انوار الٰہیہ اور فیوض شرفیہ سے مالا مال ہو کر اپنے پیر و مرشد اور نانا حضرت شاہ غلام علی دیورویؒ کے آستانہ خانقاہ برہانیہ دیورہ تشریف لائے اور یہاں مستقل قیام پذیر ہو کر خلق خدا کی خدمت و ہدایت میں مشغول و مصروف ہو گئے۔ آپ کی بیعت تو دورانِ تعلیم ہی اپنے نانا ولی المتقی حضرت مولانا شاہ غلام علی دیورویؒ کے دست حق پرست پر ہوئی تھی اور اجازت و خلافت بھی حاصل تھی چنانچہ جناب شاہ جمال حسین صاحب جو حضرت صاحبؒ کے بھانجے ہیں رقم طراز ہیں کہ " بیعت و خلافت بلا واسطہ از جد خود یافت " مگر آستانۂ شیخ پر پہنچنے کے بعد اپنے ماموں حضرت ولی العالی مولانا شاہ غلام ولیؒ کی صحبت میں رہے اور ان کے فیوض باطنی سے مالا مال ہو کر خرقۂ خلافت زیب تن فرمایا۔ مخدوم و مکرم حضرت خواجہ شاہ غلام شرف الدین معروف بہ شاہ شریف سلویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ حضرت اعلیٰ مولانا شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہیدؒ سے عرض کیا تھا کہ شجرہ بواسطہ مولانا شاہ غلام ولیؒ جاری ہے اور جناب شاہ جمال حسین صاحب بلا واسطہ تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب حضرت مولانا شاہ غلام ولیؒ کی اہلیہ (محل ثانی) نے مرید ہونا چاہا تو آپ نے حضرت صاحبؒ کو بیعت لینے کے لئے فرمایا۔ تو آپ نے عرض کیا کہ حضور کی موجودگی میں میری کیا مجال ہے۔ تو حضرت ولی العالیؒ نے مکرر ارشاد فرمایا کہ میری اجازت سے مرید کر دیجئے۔ اُس وقت سے آپ بواسطہ اپنے ماموں حضرت مولانا شاہ غلام ولی رحمۃ اللہ علیہ شجرہ دینے لگے اور وہی اب تک جاری ہے۔

فیوض و برکات

حضرت اعلیٰ قدس سرہ فرماتے تھے کہ آپ اپنے عہد کے اکابر مشائخ میں تھے۔ آپ کے علوم ظاہری و باطنی کا شہرہ اور غلغلہ تمام کاملین علم و فن اور مشائخ کرام کے کانوں تک پہنچا ہوا تھا، عوام و خواص میں ایک عام شہرت و قبولیت حاصل تھی، تشنگان علم و عرفان آتے تھے اور علم و یقین کی ایک دولت اپنے سینوں میں بھر کر لے جاتے تھے۔ حضرت اعلیٰ فرماتے ہیں کہ آخر وقت آپ پر ایک

استغراق کا عالم رہتا تھا اور اُٹھتے بیٹھتے یا حسینؓ، یا علیؓ کے دل سوز نعرہ سے چونک اُٹھا کرتے تھے۔ حضرت اعلیٰ فرماتے تھے کہ آپ کے عہد کے بعض مشائخ کبار کا خیال تھا کہ آپ کو سید الشہداء سیدنا امام حسینؓ کی بارگاہ سے کوئی خدمت سپرد تھی۔

آخری وقت کے اسی استغراقی کیفیت اور فارسی میں مختلف اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان تشیع کی طرف تھا اسی چیز کو دیکھ کر بعض اہل علموں خصوصاً شاد نے آپ پر تشیع کا الزام عاید کیا ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔ شاد نے تو "حیات فریاد" میں روز عاشورہ کے ایک ایسے واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور جو صرف نقل ہی نقل ہے۔ مرتب "مناقب کمالیہ" حضرت شاہ محمد قاسم فردوسیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ کمال علیؒ پر تشیع کا الزام بالکل غلط اور کذب محض ہے۔ ان کی شاعری میں جس طرح محبوب کی تعریف میں عام شعراء کی طرح مبالغہ ملتا ہے اسی طرح خاندان اہل بیت کے مناقب و محامد میں مبالغہ سے کام لیا ہے جس سے شیعیت کا شبہ ہوتا ہے آپ ہرگز شیعہ نہ تھے اور نہ مائل تشیع تھے۔ اس کی دو دلیلیں بہت ہی صاف ہمارے پاس ہیں ایک یہ کہ ایک ایک شعر میں ایک شیعہ مجتہد کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

باقر مجلسی کو دیکھو
کہ دشمن جانتا ہے دوستوں کو

یہ آپ کے ایک اور مثنوی کا شعر ہے جو حضرت شاہ جمال حسین فردوسیؒ کے بیاض میں ہے۔ یہ بیاض خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ میں موجود ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ کا سلسلہ مداریہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ پر منتہی ہوتا ہے اور میرے خیال میں ایک تیسری دلیل یہ بھی ہے کہ آپ کے پیر و مرشد اور نانا کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا عثمان غنیؓ سے ملتا ہے اور یہ خانوادہ صوفیانہ رجحان و مسلک رکھنے کے باوجود ہمیشہ عقیدتاً اہل سنت والجماعت رہا اور کبھی مائل بہ تشیع نہیں رہا۔

سجّادگی سے انکار ولی العالی مولانا شاہ غلام ولی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ذکور نہ تھی۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے خلفاء و مریدین اور دوسرے فقرائے عہد

جمع ہوئے اور حضرت صاحبؒ کو سجادگی کے لئے منتخب فرمایا مگر آپ نے اِن الفاظ سے انکار فرمایا کہ میں محض محبتِ پیر اور اتباعِ پیر کی غرض سے اِس آستانہ پر حاضر ہوں، میں اس لائق نہیں کہ شیخ کی جگہ پر بیٹھوں۔ آپ کی اس بات کو حاضرین نے آپ کی طبعی عجز و انکساری پر محمول کر کے اصرار کیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اصرار بے حد بڑھ رہا ہے تو آپ نے جناب شاہ خادم علیؒ صاحبؒ بن شاہ متین پلاسویؒ کو جو حضرت شاہ غلام ولیؒ کے نواسہ اور آپ کے ماموں زاد بہن کے بیٹے تھے مرید فرمایا اور خرقۂ خلافت دے کر اپنے شیخ و مرشد کا جانشین و سجادہ تسلیم فرمایا۔ حضرت شاہ خادم علیؒ کے بعد آپ کے صاحبزادے شاہ احمد علی صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے یہ سجادگی بھی حضرت صاحبؒ ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔

تلامذہ و خلفاء

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ جس پایہ کے بزرگ تھے اور علم و ادب کی دنیا میں ان کا جو مرتبہ و مقام تھا اس کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے بے شمار تلامذہ علم و فن اور شعر و سخن ہوں گے لیکن آپ کی ذات اور شخصیت پر جس طرح عزلت و گمنامی کا پردہ پڑا رہا اور آپ کے حالاتِ زندگی پردۂ خفا میں رہے تو اس بارے میں بھی کوئی تفصیلی واقفیت بہم نہیں پہنچتی، آپ اگر ایک طرف علم و ادب کے ماہر تھے تو دوسری طرف شیخ وقت اور ولی کامل بھی تھے اور تصوف کا سلسلہ چونکہ اس خانوادہ میں جاری و ساری رہا اس لئے چند خلفاء و تلامذہ کے نام ملتے ہیں جو علوم ظاہری و باطنی دونوں ہی میں اپنے شیخ کے جانشیں و متبع رہے ان میں چار مشہور و معروف ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا شاہ غلام امام سملویؒ (معروف بہ "بڑے مولانا")

۲۔ حضرت مولانا شاہ غلام نجفؒ (معروف بہ "چھوٹے مولانا")

یہ دونوں بزرگ حقیقی بھائی اور حضرت صاحبؒ کے خالہ زاد بھائی، شاگرد، مرید اور خلیفہ تھے۔

۱۔ حضرت شاہ خادم علیؒ کا سلسلۂ نسب بچند واسطہ حضرت شاہ وحید الدین چلہ کش قدس سرہ سے ملتا ہے، حضرت وحید الدین چلہ کش کی شادی بی بی بارکہ سے ہوئی تھی جو حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی پوتی تھیں۔

حضرت صاحبؒ کے وصال کے وقت چھوٹے مولانا حاضر خدمت تھے۔ آپ نے فرمایا "من ترا دادم" حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اس دن سے چھوٹے مولانا علیہ الرحمہ مراقبہ کے وقت انوار الٰہیہ کا ادراک کرتے تھے۔

۳۔ حضرت شاہ خادم علیؒ سجادہ نشیں خانقاہ برہانیہ دیورہ۔

۴۔ جناب مولانا شاہ محمد امین پھلواروی فردوسیؒ

یہ چاروں بزرگ حضرت صاحبؒ کے شاگرد، مرید اور مجاز و خلیفہ تھے اور اپنے شیخ کے علم و عمل کے سچے جانشیں تھے ان میں ایک ذات ستودہ صفات حضرت مولانا شاہ غلام امام فردوسیؒ کی ایسی ہوئی جن سے آپ کی نسبت روحانی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ازواج واولاد

حضرت شاہ کمال علیؒ کی شادی آپ کے چھوٹے ماموں حضرت شاہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی بی بی کمالؒ سے ہوئی تھی آپ کی کوئی اولاد باقی نہ رہی ایک صاحبزادے ہوئے تھے جو عالم شیر خوارگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ حضرت مولانا شاہ مجیب الحق کمالیؒ فرماتے تھے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ صاحبزادے کی رحلت سے بہت ہی غمگین اور مضطرب تھیں، جب آپ گھر میں بغرض تسلّی و تشفی تشریف لے گئے تو فرمایا صبر کرو اب نہ رہے گا نہ روؤ گی۔ اس کے بعد سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

وفات

حضرت صاحبؒ کا وصال ۷ رجمادی الثانی ۱۲۱۵ھ روز دوشنبہ، بوقت دس بجے دن بمقام آستانہ حضرت دیورہ ہوا۔ تقریباً پچاسی سال کی عمر میں اپنے وقت کا یہ بے مثال و باکمال شاعر اور آفتاب رشد و ہدایت غروب ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔

مزار پُرانوار دیورہ میں تالاب کے مشرق جانب متصل امام باڑہ جانب مغرب واقع ہے۔ نور اللہ مرقدہٗ و برد اللہ مضجعہ۔ سنہ وصال لفظ "دریغا" سے نکلتا ہے۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ وصال سے قبل اشعار ذیل ورد زبان تھے ؎

کمر پیچیدہ ام در خدمتِ او　　　　قسم ہا خوردہ ام در حضرت او

الم راخیل عشرت بپیشوا رفت | سراغ دل بجستہ دل زجا رفت

سلطان تاج بخش شیر کل کفا علیؓ است | سر نشین بارگہ کبریا علیؓ است
صاحب لوائے راکبِ ہر لافتا علیؓ است | سر دفترِ کلام مجیدے خدا علیؓ است

خانقاہ عالم پناہ برہانیہ کمالیہ دیورہ

حضرت مولانا شاہ مجیب الحق کمالیؒ کی روایت ہے کہ حضرت صاحبؒ کے وصال کے بعد بھی اس آستانہ خلق خدا کی آمد اور عقیدت مندوں کے ہجوم میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ آستانہ طالبین رشد و ہدایت کے لئے مرکز و مرجع بنا رہا۔ آپ کے بعد آپ کی زوجہ مطہرہ "حضرت بی بی کمالؒ" جو اسم با مسمیٰ خاتون اور خود ولیہ کاملہ تھیں، جب تک زندہ رہیں مریدین و متوسلین کے لئے وسیلۂ رشد و ہدایت بنی رہیں۔ آپ بہت ہی صاحب کرامت و تصرف خاتون تھیں۔ آپ سے بکثرت کرامات و تصرفات منسوب ہیں جن کے تذکرہ کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ آپ کا وصال ۱۲۳۶ھ میں ہوا اور مزار مبارک حضرت صاحبؒ کے پہلو میں جانب مشرق ہے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ کے وصال کے بعد متوسلین و مریدین کا آستانہ پر اجتماع ہوا اور تمام لوگوں نے باتفاق حضرت مولانا شاہ غلام امام فردوسی سلویؒ کو جو حضرت صاحبؒ کے خالہ زاد بھائی، شاگرد، مرید اور اجلہ خلفاء میں سے تھے خانقاہ برہانیہ کمالیہ کا سجادہ نشین منتخب فرمایا لیکن آپ نے اپنے استاد اور پیر طریقت حضرت صاحبؒ کی طرح اس منصب کو قبول نہیں فرمایا اور حاضرین کا اصرار دیکھ کر حضرت مولانا شاہ انور علیؒ کو جو حضرت صاحبؒ کے ماموں زاد بہن کے پوتا تھے مرید کیا اور خرقۂ خلافت عطا کر کے شیخ کا جانشین تسلیم فرمایا۔ حضرت شاہ انور علی صاحبؒ کا وصال آستانہ دیورہ ہی میں بتاریخ ۷ا صفر المظفر ۱۲۸۲ھ کو ہوا۔ مزار مبارک امام باڑہ سے مشرق جانب واقع ہے۔

حضرت مولانا شاہ انور علی صاحبؒ کی بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے اپنے زمانۂ حیات

ہی میں شیخی وجدی حضرت اعلیٰ شاہ احمد کبیر ابوالحسنؒ شہیدؒ کو اپنا جانشیں اور خلیفہ وسجّادہ مقرر فرمایا۔ آپ پوری زندگی خانقاہ برہانیہ کمالیہ کی مسند سے رشد و ہدایت اور سلوک و طریقت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ کے بعد سے ہنوز خانقاہ عالم پناہ برہانیہ کمالیہ کی سجادگی اس خانوادہ میں باقی و جاری ہے۔

ع دانا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

حیات حضرت کمالؒ، ایک مختصر تنقیدی و تحقیقی جائزہ

حضرت شاہ کمال علی کمال دیورویؒ کے حالاتِ زندگی پر زیادہ تر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور آپ کی حیات مبارکہ کا بڑا حصہ پردۂ خفا میں ہے۔ حالات زندگی کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو کی وادی میں جب میں نے قدم رکھا اور خاندانی کتب خانوں میں پرانے ملفوظات و مکتوبات اور بیاضوں کا جائزہ لیا تو اس سلسلہ میں بڑی مایوسی ہوئی، بزرگانِ دیورہ اور سملہ نے سوائے تاریخ اور مہینہ کے جو صرف فاتحہ خوانی کے لئے تھا، احوال و سیر لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس وقت میرے پاس حضرت صاحبؒ کا مکمل اُردو دیوان اور اُردو مثنوی موجود ہے جو خانقاہ برہانیہ کمالیہ میں موجود مسودہ کے عین مطابق اور اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد نقل ہے۔ یہ دونوں مسودے عم مکرم حضرت شاہ محمد ابراہیم صاحب فردوسیؒ سجادہ نشیں خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ نے اپنے دستِ خاص سے برادر مکرم مولانا شاہ طیب عثمانی ندوی کو عنایت فرمایا تاکہ جب بھی فرصت اور موقع ہو اس پر کام کریں۔ جب میں نے اس موضوع پر تحقیقی کام شروع کیا تو برادر محترم موصوف نے ازراہ کرم وہ مسودہ مجھے عنایت فرمایا۔ اس کے علاوہ سیرت و سوانح کے سلسلہ میں والد ماجد محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملویؒ کی مرتب کردہ قلمی تصنیف "مناقب کمالیہ" کے چند قلمی نسخے مجھے ملے وہ بھی میرے پاس محفوظ و موجود ہیں۔ مندرجہ بالا پوری سوانح

۱؎ آپ حضرت مولانا شاہ انور علیؒ کے شیخ مولانا شاہ غلام امام فردوسی سملویؒ کے پوتا اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ساڑھو مولانا شاہ ہادی علی پھلواروی کے داماد تھے۔

حیات کا ماخذ دراصل وہی "مناقب کمالیہ" ہے جو واقعہ یہ ہے کہ حضرت صاحبؒ کے حالات زندگی کے بارے میں تحقیق و جستجو کا حرف آخر ہے۔ اس کے علاوہ حضرت والد ماجدؒ کے بعض دوسرے قلمی مسودات میں اُردو کے مشہور اور مایہ ناز محقق جناب قاضی عبدالودود[1] صاحب کا ایک خط بھی ملا جس میں حضرت صاحبؒ کے سلسلہ میں مصنف "مناقب کمالیہ" سے مختلف سوالات کئے گئے تھے۔ اُن سوالات کا تفصیلی جواب مرتب "مناقب کمالیہ" نے دیا تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ یہ تمام خط و کتابت خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کے صاحب سجادہ حضرت شاہ محمد ابراہیم صاحبؒ کے توسط سے ہوئی تھی، جس کے پس پردہ مصنف "مناقب کمالیہ" تھے اور اُن سوالات کا تفصیلی جواب مصنف مناقب کمالیہ نے دیا تھا، جن کی نقل اُن کے دست خاص سے لکھی ہوئی، مسودات میں موجود ہے۔ مناسب ہے کہ اس موقع پر قاضی عبدالودود صاحب کا خط مع سوالات اور اس کا تفصیلی جواب جو مصنف "مناقب کمالیہ" حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی سیلویؒ نے دیا تھا پیش کر دیا جائے اس سوال و جواب کی روشنی میں حضرت صاحبؒ کی زندگی اور اس دور کے مختلف بزرگوں کے خاندانی حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور بہت سے ایسے گوشے جو پردۂ خفا میں ہیں ان کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

نقل خط جناب قاضی عبدالودود صاحب

بانکی پور

۵/۲۳ ۴۱

جناب من، تسلیم

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ کا اُردو، فارسی دیوان اور ان کے خطوط فارسی کا

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب نے حضرت کمالؒ کی حیات اور شاعری پر معاصر پٹنہ میں چند مضامین شائع کئے تھے اور اُردو کا مکمل دیوان اور اُردو مثنوی بھی شائع کر دی تھی جو انہیں خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہ ساری چیزیں میرے پیش نظر رہی ہیں۔

مجموعہ خانقاہ دیورہ سے میرے ایک دوست کو ملا ہے اور ان کے اصرار سے میں حضرت کمالؔ اور ان کی تصانیف سے متعلق ایک بسیط مضمون لکھ رہا ہوں، جس کی پہلی قسط معاصر بانکی پور، بابت مئی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی ہے۔

بعض امور کی تحقیق کے لئے میں نے ریاست علی ندوی مدیر ندیم کو لکھا تھا، انہوں نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ میں اس کے لئے آپ کو زحمت دوں، اگرچہ آپ سے سابقہ معرفت نہیں ہے لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک علمی کام ہے اور اس کا آپ کے وطن اور غالباً خود آپ کے خاندان کے ایک بزرگ سے تعلق ہے آپ کو سوالات ذیل کے جواب دینے کی زحمت دیتا ہوں۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ بہت سی باتوں کا جواب آپ نہ دے سکیں میرے لئے جو کچھ آپ کو معلوم ہے اُسی سے واقف ہو جانا بہت ہوگا۔ اُمید ہے کہ جواب جلد عنایت فرما کر رہینِ منت بنائیں گے۔

آپ کا خادم

عبدالودود

پتا:-

قاضی عبدالودود، بیرسٹر ایٹ لا

بانکی پور

سوالات

(۱) شاہ کمال علی صاحب کمال کے دادا کا نام شاہ سلام اللہ تھا یا سلیم اللہ؟ کیا ان کے حالات مل سکتے ہیں؟ کس امام تک اُن کا سلسلۂ نسب پہنچتا ہے وطن کہاں تھا؟ زمانہ وفات کیا ہے؟ ان کے حالات ہیں تو کس کتاب میں؟ کیا نسب نامہ موجود ہے؟

(۲) میر علی محمد شادؔ نے لکھا ہے کہ حضرت کمالؔ کے جد بزرگوار کا نام نواب نصیر الملک سید نصیر خاں تھا اور وہ شاہ سلام اللہ ... ... تھے۔ جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سید نصیر کا نام نہیں ملتا، میرا خیال ہے کہ یہ محض فرضی نام ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

(۳) شاد نے لکھا ہے کہ یہ دونوں بھائی، حضرت آدم فاتح مان پور کے حقیقی نواسے تھے یہ کہاں تک صحیح ہے، حضرت آدم کے جنھیں سادات بارہہ سے بتایا ہے، حالات کہاں ملیں گے، ان کا زمانہ کیا ہے، انہیں سید محمد قاسم عرف سید حیدر .... کا نواسہ لکھا ہے اور ان کا زمانہ پانچویں صدی یہ کیوں کر ممکن ہے، آپ کی تحقیق ان امور کے بارے میں کیا ہے؟

(۴) شاہ فیض علی صاحب پدر بزرگوار حضرت کمال کے کچھ حال معلوم ہوں تو تحریر فرمائیں، کیا ان کی کتاب "فیض الرمل" ہے یا اس کا نام سنا جاتا ہے؟ اگر شاعر تھے تو کلام موجود ہے یا نہیں؟ ان کا زمانہ حیات و ممات کیا ہے اور وطن اصلی کہاں ہے، شاد نے لکھا ہے کہ عظیم آباد کے ناظم تھے، یہ کذب محض ہے جو زمانہ بتایا ہے اس عہدہ پر دوسرا شخص تھا اور تاریخ کی کتابوں میں ان کا کہیں نام نہیں ملتا۔

(۵) حضرت شاہ غلام علی صاحب کا سال وفات کیا ہے؟ ان کے خلف و جانشین شاہ ولی صاحب کا سال وفات کیا ہے؟

(۶) شاہ فیض علی صاحب کے تین بیٹے اور .... بیٹوں کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ شاہ کلب علی اور شاہ ذوالفقار علی کا قیام عظیم آباد میں تھا کس سلسلہ سے کیا ان کی شادیاں وہاں ہوئیں تھیں۔

(۷) بیٹیوں کی کہاں شادی ہوئی اور ان کی اولاد سے کون لوگ باقی ہیں۔ مناقب کمالیہ میں حضرت کمال کے ایک بھانجے کا نام شاہ جمال حسین لکھا ہے، یہ کس کے بیٹے تھے؟ ان کی اولاد سے لوگ ہیں یا نہیں؟ کب وفات پائی؟ کیا شاعر بھی تھے؟ شاد نے لکھا ہے کہ شاہ جمال کے ایک بیٹے شاہ ولایت حسین وکیل تھے کیا آپ ان سے واقف ہیں؟

(۸) حضرت کمال کی کتب ذیل اس وقت میرے پیش نظر ہیں، جو خانقاہ کمالیہ سے مستعار ملی ہیں، دیوان اردو، دیوان فارسی، مثنوی فارسی، ترجیع بند فارسی، مفتاح الانشاء، اس کے علاوہ بھی کتابیں موجود ہیں اگر ہیں تو کہاں ہیں

اور کیا دیکھنے کو مل سکتی ہیں ؟

(۹) ایک کتاب کا نام "چہار دہ درود" مشہور ہے کیا یہ موجود ہے ؟

(۱۰) کمال الحکمت یا کمالات الحکمت ایک کا نام ہے، اصل نام کیا ہے ؟ کس زبان میں ہے ؟ کیا کوئی نسخہ موجود ہے اور آپ کی نظر سے گذرا ہے ؟

(۱۱) کیا آپ شاہ الفت حسین فریاد ولد شاہ نور الحسن صاحب ولد شاہ محب اللہ صاحب کے خاندان سے واقف ہیں ؟ شاہ باقر علی ولد شاہ وارث علی ولد شاہ محب اللہ اور فریاد ایک خاندان سے تو نہیں ؟ کیا ان کا نسب نامہ موجود ہے ؟

(۱۲) شاہ نور الحسن کی اولاد سے کون کون لوگ واقف ہیں ؟ سال وفات ؟ کیا یہ شیعہ تھے، شاد نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں جن سے شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے میری رائے میں جعلی ہیں اشارۃً حضرت کمال کو بھی شیعہ کہہ دیا ہے ۔

(۱۳) جن اصحاب کا ذکر میں نے سوالات میں کیا ہے ؟ ان کے بارے میں اگر کچھ باتیں ایسی بھی معلوم ہوں جو میرے سوال میں نہیں تو ان سے بھی آگاہ فرمائیں ۔

نقل مضمون مصنف " مناقب کمالیہ "

حضرت شاہ محمد قاسم صاحب عثمانی فردوسیؒ

بجواب خط قاضی عبدالودود [۱]

جس کسی نے کمال مان پوری یا کمال بہاری لکھا ہے یا عظیم آبادی سب نے انہی کمال دیوروی کو لکھا ہے ۔ شاہ کمال علی کی وفات ، جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ ہے ۔ "دریغا" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے ۔ ان کا نسب نامہ پدری یہ ہے شاہ کمال علی کمال بن شاہ فیض علی گیاری جاجیزی بن میر نصر اللہ عرف محمد نصیر خاں بن میر سید حسین بن میر سید محمد بن میر سید آدم ۔ میر سید آدم کے نواسے کی اولاد میر نصر اللہ نہیں ہیں بلکہ سعادت علی حیدری کاتب "فیض الرمل" ہیں ۔ سعادت علی حیدری

---

[۱] جواب کا ابتدائی حصہ کاغذات میں نہیں ملا ۔ بہرحال مضمون یہیں سے شروع ہوتا ہے ۔

کاتب "فیض الرمل" کا نسب نامہ یہ ہے :۔ سعادت علی حیدری ولد سید احمد علی الملقب بہ سید علی حیدر بن سید غلام علی بن سید ابو محمد مشہدی بن سید محمود بن سید ابراہیم ملقب بہ ملا فیاض بن سید بہاء الدین رضوی مشہدی، سید آدم کا زمانہ معلوم نہیں اور نہ ہی ان کے حالات کا علم ہے۔ فاتح مان پور گیا ہونا، شاد وغیرہ کی روایت ہے۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ سید محمد قاسم عرف سید حیدر کے نواسے تھے۔ میرے پاس ان کا نسب نامہ نہیں ہے۔ شاہ سلیم اللہ (سلام اللہ غلط ہے) حضرت میر نصر اللہ کے بھائی تھے ان کا وطن نادرہ گنج گیا تھا، سادات گیارسے تھے۔ گیار فارس کے شہروں میں سے کوئی شہر ہے یا تھا اس سے زیادہ ان کے حالات مجھے معلوم نہیں، ۴۵ برس ہوئے راجگیر میں ایک قلمی کتاب 'حالاتِ اولیا' پر سید شاہ حسین صاحبؒ کے یہاں نظر سے گذری تھی۔ نام یاد نہیں رہا، کتاب ضخیم تھی اس میں شاہ سلیم اللہ صاحب کا تذکرہ بھی کچھ آگیا تھا اور مولف کتاب نے ان سے اپنی برہمی کا اظہار کیا تھا، شاید وہ کتاب راجگیر سے ملے۔ سادات بارہاں سے شاہ سلیم اللہ کا کیا تعلق تھا، کس امام تک ان کا سلسلۂ نسب پہنچتا ہے؟ ان کے اجداد کب اور کہاں سے گیا آئے، یہ سب باتیں بتانے سے میں عاجز ہوں۔ شاہ فیض علی عظیم آباد رہتے تھے کیوں رہتے تھے آیا عظیم آباد کے ناظم تھے؟ میں ان باتوں کا علم نہیں رکھتا۔ ان کی کتاب فیض الرمل .... آستانہ سملہ کے یہاں میں موجود ہے، کتاب نظم میں ہے، شاعر تھے ان کا وطن اصلی نادرہ گنج ہی تھا۔ شاہ فیض علی کے تین بیٹے تھے۔ ان کے علاوہ بیٹیاں بھی تھیں، کتنی تھیں کہاں بیاہی تھیں نہیں معلوم۔ شاہ کمال علی صاحب کا نسب نامہ مادری یہ ہے حضرت شاہ کمال علی بن بی بی .... بنت حضرت شاہ غلام علی بن شاہ شرف الدین بن شاہ محی الدین ملقب بہ محی الدین اولیا ثانی بن شاہ معروف بن شاہ منصور دانش مند بن شیخ الاسلام والمسلمین مخدوم شیخ برہان الدین بندگی شاہ خوند میاں .... دیوان باقر میں بسلسلہ نسب نامہ ایک نام مقدم و موخر ہو گیا .... شاہ کمال علی صاحب کے بھائی شاہ ذوالفقار علی صاحب کی شادی بی بی حبین سے موضع موڑا نالی میں ہوئی تھی جو نادرہ گنج سے قریب پھلگو ندی سے پورب دکھن جانب

واقع ہے۔ یہ موضع شاہ محمد اکرم صاحب پیر بگھوی (جو حضرت باقرؒ کے بھانجے تھے اور ان کی شادی حاجی گنج پٹنہ میں ہوئی تھی) کے پروتے میاں قاسم غنی کے قبضہ میں ہے۔ قاسم غنی مرار پور گیا میں رہتے ہیں۔ شاہ کمال علیؒ کے دوسرے بھائی شاہ کلب علی کی شادی کہاں ہوئی تھی نہیں معلوم۔ حضرت شاہ کمال کی شادی حضرت شاہ حسن بن شاہ غلام علیؒ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ حضرت کمال کے تین بھانجوں کے نام مجھے معلوم ہیں۔ شاہ کمال حسین، شاہ جمال حسین اور شاہ مفتون حسین تینوں شاعر تھے۔ شاہ مفتون حسین کے بیاض اور رسالے جو خانقاہ کمالیہ دیورہ میں موجود ہیں اور اوراد و وظائف، نقوش و تعویذات، اشعار و رباعیات، غزلیات و مثنویات پر مشتمل ہیں۔ شاہ مفتون حسین کے اس بیاض میں شاہ کمال علی صاحب کی اُردو مثنویاں بھی ہیں۔ اِسی خانقاہ کمالیہ دیورہ میں حضرت شاہ جمال حسین کا مولفہ ایک رسالہ اشراق کے فن میں ہے۔ اس میں شاہ کمال علی کے خیالات اور بیانات کو بزبان فارسی قلم بند کیا گیا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ شاہ کمال علی کے بھائیوں اور بہنوں کی اولاد میں سے پٹنہ میں کون کون ہیں۔ یہ سُنا ہے کہ پٹنہ میں کچھ خاندان شیعوں کا ہے جو ان کی اولاد ہونے کا مدعی ہے۔ شاہ محمد اکرم صاحب پیر بگھوی اور شاہ لطافت حسین صاحب خسرو پور نواده کی شادیاں انہیں بزرگوں کے خاندان میں ہوئی تھیں اور ان کے متروکات انہی دونوں کے ورثاء کے خاندان میں ہیں۔ شاہ الفت حسین فریاد بھی حضرت کمال کے بھانجے ہوتے ہیں۔ کیسے بھانجے تھے خبر نہیں۔ میں شاہ محب اللہ یا شاہ نور الحسن کو نہیں جانتا۔ شاہ کمال علی صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی ایک لڑکا ہوا تھا جو ہنگام شیر خوارگی میں ہی قضا کر گیا تھا۔ شاہ محمد امین پھلواروی کی شادی پلاسی میں ہوئی تھی۔ کن کی لڑکی سے اس وقت ذہن میں محفوظ نہیں۔ شاہ محمد امین صاحب شاہ کمال علی صاحب کے تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ، کاتب و مرید اور مجاز و خلیفہ تھے اور شاہ انور علی شاہ محمد امین کے لڑکے اور شاہ کمال علی کے جانشین تھے۔ یہ صحیح ہے کہ شاہ انور علی اور مولوی شاہ ولایت حسین کی دادی دونوں حقیقی بھائی بہن تھے۔ شاہ ذوالفقار علی اور بی بی جین دونوں کو حضرت کمالؒ ہی سے بیعت حاصل تھی۔ ہاں شاہ کلب علی شاہ منعم صاحب عظیم آبادی سے مرید تھے۔ شاہ کمال علی صاحب کے مرید و خلفاء بکثرت تھے۔ چند خلفاء کے نام بیان کرتا ہوں۔ مولانا غلام امام و مولانا

غلام نجف صاحب سملہ دونوں آپ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ شاہ خادم علی اور شاہ احمد علی بن شاہ خادم علی دیورہ، شاہ غلام نجف ساکن اساس، شاہ مراد ساکن مئو، شاہ محمد امین، شاہ محمد مجید، شاہ محمد فرید صاحبان پھلواری، شاہ جمال حسین فردوسی، شاہ کمال حسین، شاہ مفتون حسین فردوسی، دیوان باقر میں شاہ عطا حسین صاحب نے یہ لکھا ہے کہ محب اللہ بیر بگھوی کی شادی سملہ میں شاہ جار اللہ صاحب کے یہاں ہوئی تھی، یہ ان سے چوک ہوئی ہے۔ اصل میں شاہ محب اللہ کی شادی شاہ یار اللہ صاحب (جو شاہ جار اللہ صاحب کے بھائی تھے) کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ شاہ الفت حسین فریاد اور شاہ باقر علی ایک خاندان کے نہیں، منشی الفت حسین فریاد کی نسبت میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے عقاید ظاہر نہیں ہونے دیئے ...... گفتگو ایسی کرتے تھے کہ شیعہ انہیں شیعہ سمجھتے اور سُنّی انہیں سُنّی لیکن انتقال کے وقت شیعوں کے طریقے پر تجہیز و تکفین کی وصیت کی۔ حضرت کمال پر شیعیت کا الزام کذب و دروغ اور بے بنیاد ہے۔ ان کا سلسلہ مدار یہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پر منتہی ہوتا ہے جو اس الزام کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اُردو مثنوی میں ایک شیعہ مجتہد کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

...... باقر مجلسی کو دیکھو   کہ دشمن جانتا ہے دوستوں کو

اس شعر کا پہلا مصرع پورا یاد نہیں۔ اصل یہ ہے کہ حضرت کمال محبوب کی تعریف میں عام شعراء کی طرح مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں۔ حضرات اہل بیت کے محامد و مناقب میں جو مبالغہ ہوا ہے اس سے لوگوں کو تشیع کا شبہ ہو گیا ہے۔

حضرت کمالؔ کی دیوان اُردو، فارسی و ترجیع بند، مفتاح الانشاء کے علاوہ آپ کی اُردو مثنویاں بھی ہیں جو خانقاہ کمالیہ دیورہ میں پیر محمد ابراہیم صاحب کے پاس ملیں گی۔ وہ سملہ عرس میں تشریف لائے تھے۔ انہیں میں نے وہ بیاض .... دی ہے۔ جس میں مثنویاں ہیں۔ آپ کے ہندی کلام بھی تھے جو میں نے دیورہ، سملہ کے بیاضوں میں نہیں دیکھے۔ مدت ہوئی میں ایک بار نرہٹ میں تھا، وہاں جناب شاہ شاہد حسین صاحب راجگیر سے تشریف لائے، ان کے ساتھ ایک ضعیف سے بزرگ راجگیریا اور کہیں کے تھے۔

جناب شاہ صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہارے خاندان کے بزرگ حضرت کمال کی ہندی چیزیں انہیں یاد ہیں اور اُن سے فرمایا کہ انہیں سُنا دو، کمسنی کا زمانہ تھا یہ خیال نہیں آیا کہ انہیں لکھ لوں۔ کلام کا کیا نام تھا اُنہیں یاد نہیں۔ ایک چیز جو انہوں نے گائی تھی ناگن کے ڈسنے کا قصہ تھا، شاید راجگیر سے حضرت کے کچھ کلام ملیں۔ چاردہ درود اور کمال الحکمت کا میں نے بھی نام سُنا ہے، سِملہ، دیورہ میں نہیں ہے۔

شاہ کمال علی صاحب اور ان کے بھائیوں کو بادشاہ وقت سے معافیاں بہت ملی تھیں شاید یہی وجہ شاہ ذوالفقار علی صاحب اور شاہ کلب علی صاحب کے قیام پٹنہ کی ہو۔ شاہ کمال علی صاحب نے ان معافیوں میں سے کچھ حصّہ نہیں لیا اور بھائی بہنوں کو چھوڑ دیا، انہوں نے اپنے نانا کے متروکہ پہ قناعت کی جو دیورہ، سعدی پور، پران پور وغیرہ میں تھا۔
آپ کے سوالات میں حضرت حیدر باگھ کا نام آیا ہے۔ یہ حضرت مخدوم الملک کے پیشتر کے بزرگ ہیں اور ان کا مزار بہار میں ہے۔ ان کی اولاد میں سے بعض لوگ چوارہ ضلع مونگیر میں ہیں۔"

عکسِ تحریر مصنف مناقب کمالیہ بسلسلہ تالیف کتاب

(زیادہ تر حالات خود حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ سے دریافت کرکے لکھے گئے ہیں
ایک روز حسب معمول، جب میں نے حضرت صاحب علیہ الرحمہ کا حال دریافت
کیا تو آپ نے فرمایا:۔

"لکھ کر کیا کرو گے، اللہ اللہ کرو۔"

اس کے بعد پھر دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت اعلیٰ علیہ الرحمۃ سے میں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ حضرت صاحب
کے حالات لکھ رہا ہوں یا لکھنا چاہتا ہوں مگر میں دریافت کرنے کے بعد
قیام گاہ میں آکر روزانہ لکھ لیا کرتا۔)

عکسِ تحریر سرورق مناقبِ کمالیہ

بدستِ خاص حضرت محبوبُ الاولیاء

شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسیؒ

مناقب کمالیہ

یعنی

تذکرہ عاشق الٰہی حضرت مولانا شاہ کمال علی فردوسی [illegible]

معروف بہ

حضرت [illegible] صاحب

(رحمۃ اللہ علیہ)

عکسِ تحریر صفحہ اوّل مناقبِ کمالیہ

بقلم حضرت محبوب الاولیاء شاہ محمد قاسم فردوسی رح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ و اہل [illegible] کی
ذات ستودہ صفات تو اس کی مستحق ہے کہ آپ کے مقدس زندگی کی
ہر جزئی حالات و کیفیات سے مفصل بحث کی جاتی اور ایک
جامع سوانح مرتب کیجاتی مگر افسوس کہ ابتداً آپ کے مقدس
زندگی کے بعض اہم حالات کچھ ایسے تاریکی میں پڑے ہیں
جن پر اب اس زمانہ میں [illegible] بزرگ [illegible]
نہ ہوتی تذکرہ آپ [illegible] سوا اس کے چارہ نا
[illegible] حالات [illegible]
اپنے بزرگوں کی زبانی گوش گذار [illegible]
حوالہ قلم کیا جاتا ہے۔ و ما توفیقی الا باللہ

عکسِ تحریر جواب خط مصنف "مناقبِ کمالیہ"

بنام جناب قاضی عبدالودود صاحب

حصّہ دوم

کمالِ شاعری

باب سوم

(الف) عہدِ کمالؒ

(ب) حضرت کمالؒ کی شاعری

(ج) حضرت کمالؒ کا تغزّل

(د) حضرت کمالؒ کی غزل گوئی کے عناصر ترکیبی

باب چہارم

(الف) مثنوی : ایک اہم صنف شاعری

(ب) دورِ کمالؒ کی متصوفانہ شاعری

(ج) حضرت کمالؒ کی مثنوی ــ ایک مطالعہ

باب سوم :

عہدِ کمالؒ

۱۱۳۰ھ تا ۱۲۱۵ھ
۱۷۲۰ء تا ۱۸۰۳ء

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کا عہد ایک زریں عہد ہے جو اُردو زبان اور شعر و ادب کی ترقی کے لئے خاص طور پر ممتاز رہا ہے۔ یہ دَورِ کمال وہی ہے، جو دہلی میں حضرت مظہر جانجاناں، خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کا دور تھا۔ حضرت کمالؒ کی ولادت اگر ۱۱۳۰ھ سنہ میں تھی جیسا کہ محققین نے قرار دیا ہے تو اس لحاظ سے میر تقی میرؔ سے آپ چار سال عمر میں بڑے تھے اور وفات ۱۲۱۵ھ سنہ میں ہوئی، اِس حساب سے میرؔ سے دس سال پہلے فوت ہوئے۔ اس طرح آپ کا عہد اُردو شعر و ادب کا دوسرا روشن دَور رہا ہے جس میں دہلی سے عظیم آباد تک بیسوں اہلِ کمال پیدا ہوئے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کے عہد سے کچھ پہلے ہی دو تہذیبوں کے میل جول سے اُردو زبان شاہ جہاں کے عہد تک پورے ملک میں رس بس چکی تھی اور شعر و ادب کی تخلیق جاری تھی۔ ۱۶۹۷ء میں شاہزادہ عظیم الشان پٹنہ آیا اور پھر پٹنہ عظیم آباد ہو کر اُردو زبان و ادب کا مرکز بنا۔ پھر فرخ سیر پٹنہ آیا اور امیر الامراء نواب سید حسین علی خاں صوبہ دار پٹنہ کی مدد سے وہ یہیں شہنشاہ ہندوستان بنا۔ فرخ سیر کی تاج پوشی عظیم آباد میں ہوئی، سید حسین علی خاں نے فوج جمع کی اور اسی فوج کی مدد سے فرخ سیر دہلی پر ۱۷۱۳ء میں قابض ہوا۔ اس طرح دہلی کی مرکزی حکومت کے ساتھ براہ راست بہار کا تعلق قائم ہوا اور شاہ جہاں آباد دہلی اور عظیم آباد پٹنہ کے درمیان سیاسی و تہذیبی دونوں قسم کے روابط و مراسم بہت بڑھ گئے۔ بہت سے امراء

دہلی چھوڑ کر پٹنہ آبسے۔ اس طرح ان کی زبان و معاشرت میں یک رنگی آنے لگی۔ مرزا عبدالقادر بیدؔل عظیم آبادی جیسے باکمال شاعر اورنگ زیب کے زمانے میں پٹنہ سے دہلی گئے اور فرخ سیر کے عہد تک اُردو زبان و ادب کو فروغ دیتے رہے اور بہار و عظیم آباد کے نام کو روشن کرتے رہے اور پھر برابر یہ زبان اِس صوبہ میں ترقی کرتی رہی اور آہستہ آہستہ سارے صوبے میں مقبول ہوتی رہی۔ عظیم آباد پٹنہ کے علاوہ بہار کے دوسرے قصبوں اور شہروں میں بھی اُردو کو فروغ ہو رہا تھا۔ گیا، آرہ، چھپرہ وغیرہ تقریباً تمام ہی اہم حصّوں میں اُردو زبان و ادب کی خدمت ہو رہی تھی اور یہ تمام مراکز بھی اُردو شعر و ادب کی تخلیق و ترویج میں مشغول تھے۔

شعر و شاعری میں دبستانِ عظیم آباد پر براہ راست دبستان دہلی کا اثر پڑتا تھا۔ اِسی لئے دبستان عظیم آباد کی اپنی کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی بلکہ دونوں دبستانوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ تاریخی وجوہ سے دہلی اور پٹنہ کی فضا ایک جیسی تھی، زندگی اور اُس کا ماحول ایک جیسا تھا۔ دہلی اگر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور سکھوں، مراہٹوں کی بغاوت اور شورشوں سے نیم جان تھا جس سے مغل حکومت اور سماج کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور اسی کے نتیجے میں یاس و قنوط کا عام ماحول اور محرومی کا احساس زیاں عوامی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے، تو ساتھ ہی پٹنہ بھی بنگال سے انگریزوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار تھا، زندگی بے چین اور دردمند تھی۔ سیاسی ابتری، معاشی زبوں حالی، معاشرتی پستی اور ذہنی و فکری پراگندگی اور دل شکستگی میں عظیم آباد پٹنہ اور شاہ جہاں آباد دہلی کا ایک حال تھا۔ سماجی حالات کی یکسانیت کا اثر بھی اِن دونوں شہروں کے دانش وروں، ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں پر یکساں پڑا اور ایک جیسا ردِّ عمل ہوا۔ زندگی سے گریز، متصوفانہ داخلیت اور درد و سوز دونوں جگہ کے شاعروں اور فن کاروں کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اِن حالات اور ادبی و شعری پس منظر میں عظیم آباد بجائے خود شعر و ادب کا مرکز بن چکا تھا اور یہاں کا ہر باکمال شاعر اپنی ذات سے ایک انجمن ایک اپنا مدرسہ فکر رکھتا تھا۔ بہار میں حضرت کمال کی ذات ایک ایسے ہی اسکول اور مکتبہ فکر کی تھی۔ جو دوسروں سے مختلف حیثیتوں میں ممتاز اور

منفرد تھے۔ اس دورِ زریں میں دہلی سے عظیم آباد تک اہل دانش اور اہل فکر کا ایک روشن سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں حضرت کمال کی شاعرانہ حیثیت کسی سے کم نہیں بلکہ زبان وبیان اور فکر وخیال کی بعض حیثیتوں سے بڑی یگانہ اور منفرد ہے۔

شعری وادبی رجحانات

حضرت شاہ کمال علی کمال کے اس عہدِ زریں میں زبان کی ترقی ہوئی۔ میر، درد اور میر سوز نے زبان کی صفائی، حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا، سودا نے فارسی کی لطیف اور نفیس تراکیب سے اردو شاعری میں وسعت پیدا کی۔ زبان کی ترقی کے لئے مشاعروں کا رواج بھی اسی دور میں ہوا۔ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے یہاں باضابطہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اسی دور میں غزل معراجِ کمال کو پہنچی۔ سوز وگداز جو غزل کی جان ہے وہ اسی دور کے ساتھ مخصوص ہے۔ تصوف کے اثر سے عشق مجازی وحقیقی کا اظہار شاعری میں عام طور سے کیا جانے لگا۔ مثنوی بھی اسی دور میں خوب پھلی، میر تقی میر، سودا، میر حسن اور میر سوز سبھوں نے مثنویاں لکھیں جو اپنی جگہ لاجواب تھیں۔ اسی دور میں حضرت کمال نے غزلوں کے علاوہ مثنوی بھی لکھی جو اس فن میں نیا اضافہ ہے۔ اس طرح جب ہم اس دور کے شعری وادبی رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مختلف حیثیتوں سے یہ دور بہت ہی ممتاز نظر آتا ہے۔ ایک طرف غزل کا یہ مایہ ناز دور ہے تو دوسری طرف مثنوی میں بھی ایک امتیازی شان پیدا ہوئی اور دوسرے اصناف سخن، مرثیہ، قصیدہ، ہجو میں نئی نئی راہیں نکلیں۔ خصوصاً صوفی شعراء نے غزل اور مثنوی کے فن کو ایک نئی آب وتاب بخشا اور ان دونوں اصناف سخن کو بام عروج پر پہنچایا۔

سب سے اہم خصوصیت اس دور کی یہ تھی کہ سارے ہندوستان میں دہلی سے لے کر عظیم آباد تک اکثر وبیشتر شعراء فکری ونظری طور پر صوفی اہلِ دل بزرگ رہے ہیں اس لئے اس دورِ کمال کو اگر صوفیانہ دور کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ دہلی میں حضرت مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد تو اہلِ دل بزرگ تھے ہی اور ان کے سارے کلام کی بنیاد تمام تر تصوف واخلاق پر تھی۔ ان کے علاوہ میر تقی میر اور سودا کے یہاں بھی تصوف واخلاق کی چاشنی ملتی ہے اور خود عظیم آباد پٹنہ بھی جو دہلی کے بعد جہاں شعروادب کا مرکز رہا ہے، ساتھ ہی تصوف واحسان

اور رشد و ہدایت کا منبع و سرچشمہ بھی تھا۔ عبدالقادر بیدل سے لے کر دورِ کمال تک، غلام نقشبند سجاد، شاہ آیت اللہ جوہری مذاق، شاہ نور اللہ تپاں اور شاہ ابوالحسن فرد، سبھی ایک طرف مسندِ رشد و ہدایت کے رونق افروز تھے تو دوسری طرف محفلِ شعر و سخن میں ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے، تصوف و احسان اور شعر و ادب کا یہ عہد دراصل حضرت شاہ کمال علی کا عہدِ زرّیں ہے۔

حضرت کمالؔ کی شاعری

شاعری کی حقیقت

اس سے پہلے کہ ہم حضرت کمالؔ کی شاعری کا جائزہ لیں ضرورت اِس بات کی ہے کہ شاعری کی حقیقت اور معنویت پر ایک نگاہ ڈالیں، شاعری کیا ہے؟ اس کی کوئی متعین اور منطقی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی عمل ہے۔ اِس لئے اس کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اہلِ علم و ادب نے مختلف تلمیحات و استعارے سے کام لیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے شاعری کو " بہترین بات اسلوب بیان کے ساتھ حسن تخیل اور حسنِ بیان[۱]" کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب " موزوں اور با اثر کلام[۲] " کو شعر کہتے ہیں۔ انگریز شعراء میں جان ملٹن نے شاعری کی تعریف میں کہا ہے کہ " شاعری کو سادہ، موثر اور پُر جوش ہونا چاہیے "۔ بعض کے نزدیک شاعری نام ہے مسرت اور بصیرت کا، پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے داغؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعری کی تعریف ذرا وضاحت سے یوں کی ہے۔" شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اِس کے جذبات دل کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصور پیدا کر دیتے ہیں[۳]"۔ اِن مختلف تعریفوں سے شاعری کا ایک اجمالی تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اِس سِلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی نے شاعری کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی ہے اِس سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شاعری کی حقیقت کو جاننے کے لئے علامہ شبلی کا مندرجہ ذیل اقتباس اِس موضوع پر شعر و ادب کے طالب علموں کے لئے مفید اور مناسب ہے۔

۱؎ مقدمہ سرود زندگی از اصغر گونڈوی

۲؎ ہماری شاعری صفحہ ۲۷ از مسعود حسن رضوی ادیب

۳؎ مضامین چکبست مضمون بزم داغ صفحہ ۶۸

" خدا نے انسان کو مختلف اعضاء اور مختلف قوتیں دی ہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ الگ ہیں ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں ۔ ادراک اور احساس ۔ ادراک کا کام اشیاء کا معلوم کرنا ہے اور استدلال و استنباط سے کام لینا ہے ۔ ہر قسم کی ایجادات تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم اسی کے نتائج عمل ہیں ۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے ۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے ۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں مسرور ہوتا ہے ۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے ۔ انہیں قوت جس کو احساس، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ شاعری کا دوسرا نام ہے ۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مثلاً شیر گرجتا ہے ، مور چنگھاڑتے ہیں ، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں ۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے ادا ہوتے ہیں ۔ لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی ۔ اس کے لئے جب اس پر کوئی قومی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اس کا نام شعر ہے ۔

آپ منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ " جو جذبات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں وہ شعر ہیں " اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں ۔ یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے ۔ اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے ۔

ایک یوروپین مصنف لکھتا ہے کہ ہر چیز جو استعجاب یا حیرت یا جوش

یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے۔ اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں، نسیم سحر، گلگونہ شفق، تبسم گل، خرام صبا، نالۂ بلبل، ویرانی دشت، شادابی چمن غرض تمام عالم شعر ہے۔

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں، موسیقی، مصوری، صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اِس کا کوئی نمایاں وصف لے لیا جائے، پھر یہ دیکھا جائے کہ اِس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کر کے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے۔

اِس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کرنا ہے یعنی اِس کو سُن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور دیگر علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے، یا سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری تحرکات کو استعمال کرتی ہے۔ یا سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مشغلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دل کش منظر دکھاتی ہے۔ لیکن یہ خاصیت موسیقی، تصویر، بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہی کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں۔ تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ، افسانہ اور ڈرامہ شاعری کی حد میں رہیں گے۔ اِن میں اور شعر میں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اعلیٰ نظمیں افسانے کی شکل میں ہوتی ہیں

اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اس لئے دونوں باہم مل جاتی ہیں تو اِن میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اِس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔ جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں۔ وہاں شاعری کی حد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیاء کا استقصاء کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔[۱]"

شاعری کی یہ ایک ایسی جانی پہچانی حقیقت ہے جو ہر دَور اور ہر زمانے میں تسلیم رہی ہے اور رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی احساسات کی حسین مصوّری اور تخیّل کا ایک دل فریب رقص ہے جو جنت نگاہ بھی ہے اور فردوس گوش بھی اِس کا اثر دل دماغ دونوں پر ہوتا ہے اور جو انسانی قلب و روح کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور اُن پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن انسانی جذبات سے اِس گہرے تعلق کے ساتھ ساتھ شاعری کا انسانی زندگی میں اُس سے اُجالا پھیلاتا ہے۔ اور افراد و اشخاص اِس سے روشنی اور تابندگی حاصل کرتے ہیں۔ غرض شاعری کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں اِس میں مختلف اور متنوع عناصر کے امتزاج سے نت نئے رنگ و آہنگ پیدا ہوتے ہیں۔ الفاظ، معانی، خیال، جذبہ یہ ایسے عناصر ہیں جو شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اور دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ جب شاعری کے الفاظ میں خیال کا خون دوڑتا ہے اور جذبہ کی حدت پیدا ہوتی ہے تو اس میں زندگی کا حسن، جوانی، دل کشی نمایاں ہوتی ہے۔ شاعری بنیادی طور پر شاعر کا جذباتی اور ذہنی تجربہ ہے۔ اس تجربہ میں اس کی پوری شخصیّت کا عطر ہوتا ہے اور شخصیّت کی تعمیر میں اس کا ماحول، اس کی تہذیبی قدریں، دراثت، روایت سب کا دخل ہوتا ہے۔ شاعر جہاں اپنے دَور کا نغمہ خواں ہوتا ہے وہاں مستقبل کا پیام بر بھی ہوتا ہے ایسے ہی شعراء کو شاعر فردا کہا گیا ہے۔

---

[۱] شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی

شاعری کا کمال

حضرت کمالؔ کی شاعری، شاعری کا کمال ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جہاں دِلّی نے باکمال شعراء پیدا کئے اُن میں مرزا مظہر جان جاناں، میر اور دردؔ جیسے ممتاز اور بلند مرتبہ شاعر ہوئے، اُسی دور میں سرزمین بہار میں ایک ایسا دیدہ ور اور باکمال شاعر پیدا ہوا جو کسی طرح اپنے معاصرین سے کم نہ تھا بلکہ بعض فنی اور شعری اوصاف میں وہ حد درجہ منفرد، بے مثال تھا میری مراد حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی سے ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور صوفی، اہلِ دل بزرگ تھے۔ رشد و ہدایت اور تصوف اُن کا خاص میدان تھا اور ساتھ ہی علم و فضل کی وہ کونسی بلندی تھی جہاں اُن کی رسائی نہ ہو۔ فطری ذہانت، غیر معمولی صلاحیت کے وہ مالک تھے اور پھر وہ زندگی بھر راہِ طریقت کے مسافر رہے۔ اس طرح وہ تصوف و احسان کی تمام منزلیں طے کر کے اپنے وقت کے باکمال اہل اللہ میں اُن کا شمار ہوا۔ حضرت مخدوم برہان الدین دیورویؒ کے روحانی فیوض کے ساتھ شعر و سخن کا ایک پاکیزہ مذاق پایا تھا۔ آپ کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ باکمال شاعر عزلت و گمنامی کے پردے میں چھپا رہا اور اپنی بے نفسی، بے ریائی کے باعث شعر و ادب کے ان گہرہائے آبدار کو کبھی دنیا کی نگاہوں کے سامنے نہیں لایا۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی درویشی، شاعری کی راہوں میں حائل رہی۔ علمی و دینی کاموں سے جب وقت بچتا تو اُن کے اندر کا جذبہ بے ساختگی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا۔ اس طرح اُردو شاعری کو انہوں نے جو کچھ دیا جو کسی طرح اُن کے معاصر شعراء سے کم نہ تھا۔ خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کے مقابلے میں چاہے اُن کے کلام کا مقدار کم ہو لیکن اُن کی شاعری کا معیار و وقار اُن سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اُن کا مختصر اُردو کلام جو غزلوں اور ایک طویل مثنوی پر مشتمل ہے، اِس کو دیکھتے ہوئے اِس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اُردو کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ اگرچہ بہار کے ایک کوردہ دیہات "حضرت دیورہ " کی خانقاہ میں عزلت نشین ہو کر دہلی اور عظیم آباد میں مقیم شعر و ادب کی دُنیا میں اپنی جولانیٔ طبع کو صرف کرتے تو شاید اس دور کے سب سے مشہور اور ممتاز شعراء میں اُن کا شمار ہوتا۔

حضرت کمالؒ اپنے وقت کے بڑے باکمال بزرگ تھے۔ اُن کی علمیت و ادبیت

اپنی جگہ مسلم تھی۔ علوم ظاہری و باطنی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دین و دنیا اور حقیقتُ مجاز دونوں کے اسرار و رموز اُن کے سامنے عیاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں فنّی لطافت کے ساتھ بڑی معنویت ملتی ہے۔ انہوں نے اچھی شاعری کی تخلیق ہی نہیں کی بلکہ اچھی شاعری کے امکانات کو روشن کیا، زبان و بیان میں اِس سادگی، برجستگی اور شگفتگی ملتی ہے کہ بسا اوقات گمان ہوتا ہے جیسے بیسویں صدی کا کوئی شاعر ہو۔ جذبہ کے ساتھ فکر و خیال جگنو کی طرح چمک اُٹھتے ہیں۔ آج ملّتِ اسلامیہ کا قافلہ جس طرح حیرت سے کھڑا اپنے لئے کسی "میر کارواں" کا منتظر ہے۔ آج سے دو سو برس پہلے کا اِس شاعر نے اِس کی کیسی پُر اثر تصویر کشی کی ہے ؎

کھڑا ہے قافلہ حیرت سے مثلِ سنگِ نشاں
خدا کرے کہ ابھی میرِ کارواں آئے

کیسی حسرت اور آرزو ہے اِس شعر میں اور جدید ہندوستان کی اِس بے سر کی ملّت کی کیسی المناک تصویر ہے۔

میر تقی میر نے اپنے ترکِ اسلام کا ذکر اور پوری ملّتِ اسلامیہ کے ہندوانہ رسم و رواج کو اپنانے اور تہذیبی اقدار اختیار کرنے کے المیہ کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترکِ اسلام کیا

اِسی حقیقت کو حضرت کمالؒ نے جس سادگی اور خوب صورتی سے ادا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ سہل ممتنع کا شاہکار ہے ؎

آہ، زنّار بند دیکھ مجھے — بُت حیرت سوں برہمن رویا
آہ ایماں سوں اِس قدر گذرا — کفر پر میری برہمن رویا

یہ ملّت اپنے ایمان سے اس قدر دُور ہوتی ہے کہ اِس کے کفر پر برہمن بھی روتا ہے اِس کی زنّار بندی کو دیکھ کر بُت بھی حیرت زدہ ہیں۔

حضرت کمالؒ کو اپنی درویشی میں جو کمال حاصل تھا اُن کی شاعری، اِس کی تصویر نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے تصوف کو محض رسمی اور روایتی انداز سے نہیں دیکھا۔ اُن کا تصوف "برائے

شعر گفتن" نہ تھا وہ تصوف کے صرف تماشائی نہ تھے بلکہ انہوں نے سلوک کی وہ تمام منزلیں طے کی تھیں جن سے گزرنا کسی شیخ کامل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ وہ شیخ کامل تھے۔ اپنے روحانی ارتقاء کے لئے تصوف کے تمام مراحل سے وہ عملاً گزرے، ذہن وفکر کو جلا بخشا اسی کے ذریعہ عرفان ذات تک پہنچے، انسان اور انسانیت کی حقیقت تک رسائی حاصل کی، زندگی کے اسرار و رموز اُن پر روشن ہوئے۔ فلسفہ تصوف کی حقیقت سے وہ آشنا تھے۔ جس نے اُن کے کلام میں فکر کی گہرائی و گیرائی بخشی۔

حضرت کمالؒ کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی عظمت کی بات کی، زندگی کی اصل حقیقتوں پر سے پردہ کشائی کر کے انسان کے مقصدِ وجود کو روشن کیا اور آخرت کی حقیقت کو نہایت خوبی سے اس طرح پیش کیا کہ کاروان عمر کے قدموں کے نشانات ملکِ عدم کی جانب نظر آنے لگے ؎

جُز مشت خاک کچھ نہ رہے گا نشان عمر — ملکِ عدم کو جاتا ہے، یہ کاروانِ عمر
سرکش نہ ہو تو ہستی موہوم پر کبھی — چھپ جائے گا زیرِ خاک ابھی آسمانِ عمر
فرصت کہاں ہے سیر کی پیری ہیں باغ کی — آئی ہے صبح ہوتے ہی فصلِ خزانِ عمر

مستی کی جا خمار رکھے ہے شراب عمر — موجِ ہوا سوں ٹوٹے ہے جامِ حبابِ عمر
غافل نہ ہو کمال، ٹک اک چشم کھول دیکھ
ہے آخرت کی دشت میں جوئے سرابِ عمر

آخری شعر اس پوری غزل کی جان ہے۔ "آخرت کی دشت میں، جوئے شرابِ عمر" کی تشبیہ حضرت کمال کے فکر وفن کا نقطۂ عروج ہے۔

عشق کا تصوّر شعراء کے یہاں عام ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کے ارتقاء میں اقبال سنگ میل ہیں اور انہوں نے اس تصوّرِ عشق کو نیا معنی دیا، حضرت کمال جو اقبال سے دو سو برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے یہاں عشق کے روایتی تصوّر سے ہٹ کر جو نئے معانی ملتے ہیں وہ اُن کی ذہنی عظمت اور روحانی بلندی کا پتہ دیتے ہیں ؎

غذائے عشق ہوا جسم ناتواں میرا — ہوا ہے نذر ہُما جسم استخواں میرا
شرابِ عشق سے بیخود ہوئے وہی ساقی — سُنے جو گوشِ سموں (سے) دل کے کبھی بیاں میرا

کوئی بھی اُڑ کے کہیں پہنچا اوجِ عشق کے تئیں — کہاں سُنا کہ کسی نے کبھی ہما دیکھا

کس کو خبر ہے آہ میرے داغ عشق کی — خاموش ہو کے جلتا ہے یعنی کبابِ دل
آتش بلند کیوں نہ کرے داغ عشق کی — جل نہیں (نے) ہی میں رکھے ہے مزا یہ کبابِ دل

جو داغ عشق اس کو کہو یا کہ تجھ کہو — رکھتا ہے اپنے جیب موں (میں) ایک آفتابِ دل
اک داستانِ عشق ہے یعنی کتابِ دل — نازک ہے بوئے گل سوں (سے) بھی یعنی دماغِ دل

غذائے عشق، شرابِ عشق، اوجِ عشق، داغِ عشق اور داستانِ عشق کی جو تفسیر و تصویر ہمیں اِن اشعار میں ملتی ہے وہ اپنی ندرت، ذہانت اور اظہار حقیقت میں اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر کے جیب و داماں میں ایک ایسا آفتاب دل ہے، جس سے داغ نمایاں ہے اور شاعر کے کتاب دل میں ایک پوری داستان عشق پوشیدہ ہے۔ اور شاعر کے عشق کی بلندی ایسی ہے جہاں ہُما کے بال و پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔

حضرت کمالؔ کے تصورِ عشق میں پاکیزگی کے ساتھ صحت مندی بھی پائی جاتی ہے۔ اُن کے یہاں عشق کا ایک تصور ہے۔ جن کی بنیاد الٰہی تقدس اور پاکیزہ جذبہ پر ہے، زندگی میں اِسی اعلیٰ عشق کے تصور سے جان آتی ہے اور اسی سے انسان روحانی طور پر ارتقاء کے منازل طے کرتا ہوا اپنی تکمیل سے ہم کنار ہوتا ہے۔

اسی عشق نے حضرت کمال کے یہاں ہجر کا عذاب، فراق کی لذت، داغ محبت سے خیل غم کا وفور جیسے مختلف قسم کے جذبات پیدا کئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہجر کا کیا عذاب ہوتا ہے — آہ دوزخ کا کچھ عذاب نہیں

پڑی ہے غم کے تلاطم میں صبر کی کشتی
عبور کیوں کر کروں بحر بیکراں فراق

جہاں کے داغِ محبت ہے خیل غم واں ہے
جہاں کہ آگ نہ ہو قافلہ وہاں نہ رہے

زندگی کے کارواں کے لئے داغ محبّت کی آگ ناگزیر ہے اور یہ داغِ محبت خیل غم سے پیدا ہوتی ہے۔ جذبہ کی کیسی جاں گدازی اور فکر کی نازگی اِن اشعار میں ملتی ہے۔ دَورِ جدید کے اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

حضرت کمالؔ تصوّف اور احسان کی جس منزل پر گامزن تھے وہاں خون جگری، جاں سوزی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ اُن کی پوری دیوان خون جگر کا نقش دوام معلوم ہوتی ہے ؎

لکھا ہوں خونِ جگر سے میں اپنے دیواں کو
عجب کہ روئے زمیں پر یہ داستاں نہ رہے

اسی تپشِ عشق نے دل میں ایسا اضطراب اور کسک پیدا کی جو ساری زندگی باقی رہی، آخر وہ تڑپ مرنے کے بعد شاعر کے خاک مزار میں اہلِ نظر کو نظر آتی ہے۔

مرنے کے بعد بھی نہ گیا دل کا اضطراب
تڑپے ہے آج تک مری خاک مزار دیکھ

حضرت کمالؒ کے یہاں عشق کا تصوّر اعلیٰ اخلاقی اقدار کے پس منظر میں نت نئے معانی اور مضامین کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ عشق اُن کے نزدیک ایک نہایت ہی مقدس اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ زندگی میں اسی جذبہ کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس کے بغیر انسان کی فکری

و عملی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں۔ اِس وادیٔ پُر خار میں قدم رکھنے کے لئے اُن تقاضوں کو پورا کرنا ہی ہوگا۔ اس راہ میں بے شمار رہزن ہوتے ہیں، اس کے لئے چوکنا رہنا ضروری ہے ؎

جرس کے شور کا مضموں یہی ہے اے سالک
کہ راہِ عشق میں رہزن ہیں بے شمار نہ سو

راہ کے اِن رہزنوں کے ساتھ مشکلات، مصائب، پریشانیاں، ذلّت و رسوائی اس کے مقدّر میں ہوتی ہے ؎

تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد
کہیں کسی کا محبّت میں ننگ و نام رہا

بیاں جو کیجئے اسے بے شمار ہو دفتر
کمالؔ جور کا ظالم سے کچھ حساب رہا

غذائے عشق ہوا جسم نا تواں میرا
ہوا نذرِ ھما جسم استخواں میرا

میں کیوں کر صبر کروں اور بے قرار نہ ہوں
کسی کا عشق میں کچھ صبر اور قرار رہا

غم سے ہوا حواس پراگندہ اس قدر
اور ان جیوں کے ہو پریشاں کتاب کا

ان اشعار میں حضرت کمالؒ کے عشق کی بے قراریاں، پریشانیاں نمایاں ہیں۔ حضرت

کمالؔ کے عشق باخبر کا قافلہ، سخت جاں شاہراہ حیات پر برابر آگے ہی کی طرف بڑھتا رہا ہے یہ عشق ہمیشہ انسان کے ساتھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کمالؒ کی شاعری میں انسانی اور آفاقی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں اور اسی چیز نے اُن کے یہاں آفاقیت کا وسیع تصور پیدا کیا ہے جو اس دَور کے شعراء کے یہاں کم یاب ہیں۔

خدا کی عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت کا تصور صوفیائے کرام کا مرکزی نقطۂ نظر اور محور ہوتا ہے۔ جس کے گرد اُن کی پوری زندگی گھومتی ہے، انسانیت اور انسان دوستی کا یہی جذبہ ہے جس کی خاطر وہ پوری زندگی انسانوں کے کام آنے، اُن کے دکھ درد میں شریک رہنے اور اُن کی خدمت کو وسیلۂ عبادت بنانے میں گذارتے ہیں۔ حضرت کمالؔ جو اس راہ کے سچے مسافر تھے اور اپنے تمام علم وفضل کے باوجود اُمراء و بادشاہانِ وقت سے دور رہ کر انسان اور انسانیت کی خدمت ہدایت کے لئے عزلت وگم نامی کی زندگی میں انسانی زندگی کی تاریک راہوں کو یقین کی روشنی سے منوّر کرنے اور اندھیرے میں اُجالا پھیلاتے رہے۔

عرفان ذات سے عرفانِ حیات اور پھر عرفان الہٰی تک پہنچے، جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ حقیقت کے اِس شعور نے اُن کے یہاں روحانیت کی بلندی کے ساتھ سماجی شعور کو جنم دیا اور اس دَور کے سیاسی و سماجی انتشار و فشار کی پرچھائیاں بھی ہمیں اُن کے کلام میں ملتی ہیں۔ یہ شعر اس دَور کے سیاسی و سماجی انتشار کی طرف واضح اشارہ ہے ؎

اُڑتا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں
منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہ بر کہیں

آزادئ رائے اور آزادئ فکر انسان کا بنیادی حق ہے لیکن شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام کی زباں بندی کی کیسی مُنہ بولتی تصویر آپ کو اِس شعر میں نظر آئے گی ؎

ایسا خموش رہتا ہوں میں اس کے سامنے
گویا زباں کبھی نہ تھی اپنے دہن کے بیچ

حضرت کمالؔ کی شاعری کا رنگ عاشقانہ کے ساتھ ساتھ عارفانہ ہے، موضوعات میں تنوع اور مضامین میں بڑی وسعتیں نظر آتی ہیں۔ مضامین اور موضوعات کی رنگارنگی

کے باوجود فن کا کمال برقرار ہے۔ زبان کی سادگی، بے ساختگی اور دلکشی میں کوئی فرق آپ نہیں پائیں گے۔ غزل کی داخلیت، غنائیت اور رمزیت وایمائیت کے بہترین نمونے حضرت کمالؒ کی شاعری میں جگنو کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔ حضرت کمالؒ کی شاعری کا تفصیلی جائزہ تو ہم حضرت کمالؒ کی غزل گوئی اور حضرت کمالؒ کی مثنوی پر اظہار خیال کے موقع پر کریں گے۔ یہاں حضرت کمالؒ کی شاعری کا عمومی تعارف مقصود ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے حضرت کمالؒ کی شاعری کا شعری حسن و جمال، فکر انگیز خیال اور فنی کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کو پڑھ کر حضرت کمالؒ کی شاعری کی دنیا میں منفردانہ حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے باعتبار مضامین اور باعتبار فن کے جو انہوں نے گراں قدر اضافے کئے اُن کی قدر و قیمت نمایاں ہوتی ہے ؎

فغاں کو سن کے مری آہ، کس کو تاب رہے
اگرچہ کانپوں ہوں تارِ رباب کی مانند

ہرچند کہ دل خستہ ہوں راضی ہوں رضا پر
گو خونِ جگر کھاتا ہوں شاکر ہوں قضا پر

جز مشتِ خاک کچھ نہ رہے گا نشانِ عمر
مُلکِ عدم کو جاتا ہے یہ کاروانِ عمر

صدا جرس کی نہیں پہونچی آج تک مجھ کو
بس گردِ راہ ہوا میرِ کارواں کی قسم

خطر ہے بحرِ خرد میں اگر جنوں نہ ہووے
جہاز غرق ہو گر اس میں ناخدا نہ رہے

کبھی جو مہرِ جبیں بے نقاب ہو جائے
ہر ایک ذرّہ وہیں آفتاب ہو جائے

بیاں میں حال پریشاں میرا کہاں آئے
یقیں ہے قطرے میں کب بحرِ بیکراں آئے

کبھی جو اہلِ بصیرت کی ایک نظر ہو جائے
جو بے ہنر ہوں وہی صاحبِ ہنر ہو جائے

اب کہاں تابِ انتظار کی ہے
مجھ پہ ایک لحظہ سو قیامت ہے

حضرت کمالؒ کا تغزل

ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ایک خاص قسم کی مخصوص فضا ہوتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات، ذہنی تصورات اور تہذیبی اقدار و احوال کے پس منظر میں نشو و نما پاتی ہے۔ خواجہ میر درد اور میر تقی میر سے لے کر حسرت، اقبال اور جگر تک اردو غزل مختلف رنگ و آہنگ سے گذری ہے۔ غزل جو حسن و عشق کے اظہار کا وسیلہ اور ہمیشہ ترجمان رہی ہے ہر دور میں اس کے اظہار کے انداز بدلتے رہے ہیں۔ گذشتہ دو سو برس جو حضرت کمالؒ کا دور ہے، وہی زمانہ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کا بھی ہے۔ اُس دور کے جو تہذیبی اقدار اور فکری رجحانات تھے اُس کی ترجمانی ہمیں درد، میر کے یہاں ملتی ہے اور حضرت کمالؒ کی غزلوں میں بھی اُس دور کی فکری لہریں اور تہذیبی اقدار کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حضرت کمالؒ کا دور اُردو غزل کے ابتدائی دور کے رجحانات کا عکاس ہے۔ پھر بھی حضرت کمالؒ کے یہاں عشق کے تصور میں احساس جمال کی تازگی اور رفعت ملتی ہے۔ شاعر کے تجربے اور انسانی جذبے اِس کے اخلاقی اقدار کے پس منظر میں ہم آمیز نظر آتے ہیں۔ غزل کی جڑیں ہماری تہذیب اور جذباتی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، اس کے ہر دور کے غزل گو شعراء کے یہاں اپنے دور کے احوال و کوائف اور سیاسی و سماجی شعور کی جھلکیاں ملیں گی۔ حضرت کمالؒ کی غزلیں اِس لحاظ سے بڑی ممتاز ہیں کہ اُن میں زندگی کی بجلیاں اور روحانی تجلّیاں دونوں ہی کی کارفرمائی ہے۔

حالی نے غزل پر تنقید کی ہے اِس تنقید کا محرک اصلاحی تھا اُن کے نزدیک حسن و عشق کا عامیانہ تصوّر بداخلاقی کا ترجمان تھا۔ جس سے اجتناب ضروری ہے۔ حالی کی نیک نیتی اور اخلاص شبہ سے بالاتر ہے۔ شمالی ہندوستان کے بگڑے رؤسا اور نوابوں کے زیرِ سرپرستی جو غزل گوئی کی جارہی تھی وہ بلاشبہ مخرب اخلاق بھی تھی اور قومی ہلاکت کا باعث بھی۔ لیکن غزل کے

مزاج میں بلندی ہے ادنیٰ درجہ کی شاعری اعلیٰ غزل کا نمونہ نہیں بن سکتی۔ جدید دور میں حسرت، اصغر، جگر کی غزلیں اپنی بہترین روایات کی حامل ہیں۔ اور اقبال نے تو غزل کا پیمانہ ہی بدل دیا' اور اردو شاعری حسرت، فانی، جگر اور اقبال کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی ہے۔ غزل کے دور جدید کے پیمانہ کو سامنے رکھ کر بھی اگر ہم گزشتہ دو سو برس پہلے کے ایک گمنام مگر باکمال شاعر کے کلام کا جائزہ لیں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ غزل کے بدلتے ہوئے پیمانہ کے باوجود اِس کے تغزل میں بڑی تازگی، شگفتگی اخلاقی پاکیزگی اور روحانی بلندی ملتی ہے جو اپنے معاصرین شعراء مرزا جان جاناں، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے درمیان نکلتا ہوا قد دکھائی دیتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم حضرت کمالؒ کی غزل گوئی کا تفصیلی جائزہ لیں' ضرورت اِس بات کی ہے کہ بنیادی طور پر صنف غزل کا ایک جائزہ لے لیا جائے اس سلسلہ میں غزل کی تعریف غزل کے اقسام اور پھر غزل کا ایک تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور ان کی روشنی میں اُردو غزل کی انفرادیت پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس کے بعد ہی غزل گو شعراء میں حضرت کمالؒ کے مقام و مرتبہ پر ہم کوئی گفتگو کر سکیں گے۔ اور اُن کی قدر و قیمت کو جان اور پہچان سکیں گے۔

غزل کی تعریف اور ہئیت

اُردو شاعری میں غزل اپنے تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ مشہور اور ہر دل عزیز ہے۔ ہر خاص و عام میں یکساں مقبول و معروف ہے اور سب کی پسندیدہ ہے۔ مشاعروں کی جان اور محفل سخن کی آن بان ہے۔ اُردو شاعری میں کوئی صنف سخن بھی غزل کے مقابلہ میں مقبول عوام نہیں۔ اِس صنف نے اپنی خاص آواز اور نئی آہنگ پیدا کی۔ یہ آواز اور آہنگ مشاعروں کی جان بن گئے جو ہندوستانی عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ یہ غزل کا جادو ہے جو آج بھی فلموں' ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ مخالفین اور معاندین اُردو کے سر چڑھ کر بول رہی ہے اور جس نے اردو زبان کو زندگی اور تابندگی بخشی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ غزل بقول رشید احمد صدیقی "اُردو شاعری کی آبرو ہے۔"

غزل کے لغوی معنی سوت کاتنا یا سوت بانٹنا کے ہیں جو بعد میں عورتوں سے

بات چیت کرنے کے معنی میں استعمال ہوئے۔ رفتہ رفتہ غزل کے معنی عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کرنا مراد لیا جانے لگا اور پھر انسانی جذبے کے اظہار کا نام غزل پڑ گیا اور اس میں بڑی وسعت ہوگئی، اب ہر طرح کے جذبات، خواہ وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ، اچھے ہوں یا بُرے، روحانی جذبے ہوں یا مادی جذبے، سب کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ غزل قرار پایا۔

غزل کی عام طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک غزل مسلسل اور دوسری غیر مسلسل۔ غزل مسلسل میں تسلسل خیال ہوتا ہے۔ ہر شعر کا تعلق دوسرے شعر سے قائم رہتا ہے اگر بیچ سے ایک دو شعر نکال دیں تو معنی میں خامی اور لطف میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف غزل غیر مسلسل کا ہر شعر منفرد ہوتا ہے۔ کسی خیال کے ادا کرنے میں کسی دوسرے شعر کی حاجت نہیں رہتی بلکہ کوئی خاص جذبہ یا خیال دو مصرعوں میں اس طرح نظم کیا جاتا ہے کہ اس سے پورے معنی ادا ہو جاتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس خیال کو ادا کرنے کے لئے چند اشعار کی ضرورت ہو۔

غزل کا پہلا شعر، ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتا ہے، اُسے مَطلع کہا جاتا ہے۔ مَطلع کے بعد کا شعر اگر مطلع ہے تو اُسے مطلع ثانی کہتے ہیں۔ لیکن اگر مطلع نہیں ہے تو اُسے حُسنِ مطلع، اس کے بعد کے اشعار کو شعر کہتے ہیں۔ ان سب میں قافیہ اور ردیف کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ سب سے اچھے شعر کو "بیت الغزل" کہتے ہیں اور غزل کا خاتمہ مقطع پر ہوتا ہے۔ جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔ عام طور سے غزل نظموں میں سب سے چھوٹی نظم ہے۔ کم سے کم شعروں کی تعداد پانچ ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں۔ پُرگو اور مشاق شعراء بیس بیس[۲۰] پچیس پچیس[۲۵] اشعار کی غزلیں کہتے ہیں[۱]۔ دور جدید میں فراقؔ گورکھپوری کی غزلیں کافی طویل ہوتی ہیں۔

غزل کی یہ فنّی تعریف اور توضیح اس کے ظاہری شکل و صورت سے متعلق تھی، غزل کی معنوی خصوصیات کے اظہار کے لئے غزل کا تنقیدی مطالعہ ناگزیر ہے۔

۱؎ اُردو غزل کی نشوونما از ڈاکٹر رفیق حسین صفحہ ۳۱، ۳۳ سے ماخوذ

غزل کا تنقیدی مطالعہ

بظاہر غزل سب سے آسان صنف نظر آتی ہے۔ اس لئے ہر مبتدی غزل گوئی سے اپنی شاعری کا بسم اللہ کرتا ہے۔ تھوڑی توجہ سے چند اشعار موزوں کیے، مطلع کہا اور مقطع کہہ کر غزل تمام کی، مشاعروں میں پہنچے اور واہ واہ کے ساتھ غزل سنائی بلکہ گائی، سامعین نے الفاظ و معانی سے زیادہ آواز اور نغمہ پر توجہ دیں اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ شاعر نے سمجھا کہ واقعی ہم نے شعر و سخن کی بساط پر اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔ غزل کے معیار کے پست ہونے کی اصل وجہ یہی ہے۔ حالانکہ غزل ایک مشکل صنف شاعری ہے۔ فکر اور جذبہ کی ہم آمیزی اور شعری و فنی ریاض کے بغیر اچھی غزل کا کہنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں غزل پر نکتہ چینی کی اور غزل کو سستے جذبات اور فرسودہ خیالات اور انتشار ذہن کا نتیجہ قرار دیا، حالی کی یہ لے بڑھتے بڑھتے کلیم الدین احمد تک پہنچی اور انہوں نے اس صنف شاعری کو ایک وحشی صنف شاعری قرار دیا۔ حالی کی تنقید کے پیچھے اصلاحی جذبہ تھا اُن کی نیت بخیر تھی۔ کلیم الدین احمد کے پاس تنقید کا صرف ایک ہی معیار رہا اور وہ تھا مغرب کی شاعری اور نقالی جو چیز مغرب کے بازار میں نہ ہو اُس کی کوئی قدر و قیمت اُن کے یہاں نہیں۔ کلیم الدین احمد کے خیال میں شاعری کے لئے تسلسل خیال ضروری ہے۔ اس لئے غزل پراگندہ خیالی کا نام ہے جو ایک وحشی اور غیر مہذب صنف شاعری ہے۔

غزل پر ان دونوں علماء کے فنِ نقد کی تنقید و تقیع ہونے کے باوجود، بات اتنی آسان اور سادہ نہیں ہے۔ غزل کی جڑیں ہماری تہذیب، روایات، احساسات اور زندگی کے جذبات کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، انہیں اُکھاڑ پھینکنا سہل نہیں۔ حسرت، فانی اور اصغر نے جو غزل کی نئی روایت قائم کی ہے اس سے غزل کی دُنیا ہی بدل گئی اور غزل انسانی احساسات کی ترجمانی کا معیار بن گئی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس غزل کی زندگی آمیزی اور زندگی آموزی کا بہترین ترجمان ہے اور جس سے میری بات مکمل ہو جاتی ہے:۔

"غزل کی ایمائی کیفیت، نازک خیالی اور جذبات کی گرمی کا بہترین اور

اعلیٰ معیار غالب نے اُردو میں اور حافظ نے فارسی میں اپنی شعری تخلیقات سے قائم کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو فارسی غزلوں میں اُن کی ہمسری ممکن نہیں لیکن رفتہ رفتہ اُردو غزل مجازی عشق و محبت، ہجر و وصال، لب و رخسار اور زلف و گیسو میں اُلجھ کر رہ گئی ۔ اس طرح گویا اُردو شاعری حسن و عشق کے سستے جذباتیت میں کھو کر گم ہوگئی اور جذبات بھی زیادہ دیر تک غزل کا ساتھ نہ دے سکی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا میں غزلوں کے مضامین میں جو تنوع، لطف اور لذت خیال ہوتی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہی اور پھر معاملہ بندی، قافیہ پیمائی، تقلید پرستی اور لفظی اُلٹ پھیر غزلوں کے معیار قرار پائے ۔

اقبال نے غزل کی اِس مریضانہ کیفیت کو یکسر بدل دیا اور غزل کے لئے ایک ایسا صحت مند اور پاکیزہ قالب عطا کیا، جس نے اِس صنف شاعری کو پھر سے زندہ جاوید بنا دیا اور اس گل و لالہ، زلف و گیسو اور جام و مینا میں اپنے آتشیں نفسی سے ایک نئی جان ڈال دی، اس طرح الفاظ کے معنی بدل گئے، بے جان لفظوں کو جان دار بنا دیا جو عیش کوشی اور تن آسانی کی علامت تھے وہی الفاظ حرکت و عمل کے حدی خواں ثابت ہوئے ۔

اگر جہانِ شعر و ادب میں اقبال کا وجود نہ ہوا ہوتا اور ہم اقبال کی غزلوں کی نغمہ سنجیوں سے اپنے شعور و وجدان کو جلا نہ بخشے ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ کلیم الدین احمد کے خواب کی تعبیر کے لئے وجہ جواز کی کوئی صورت نکل آتی لیکن اقبال اور اُن کے چند ہم عصروں (حسرت، فانی، اصغر اور جگر) کی غزلوں نے اُردو غزل گوئی پر سے اِس الزام کو دور کر دیا کہ یہ دَورِ انحطاط کی مریضانہ شاعری کی عکاس ہے ۔ اقبال کی غزل میں ہمیں جو قوت و تازگی، حسن ادا، حسن تاثیر، زندگی گرم نفسی اور جاندار رمز و ایما ملتے ہیں، اُن کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے ۔" [۱]

---

[۱] حدیثِ اقبال : از جناب طیب عثمانی ندوی صفحہ ۷۰، ۷۱

غزل کے آغاز کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اس نے عربی قصیدے کے ابتدائی حصّے سے جنم لیا۔ جسے تشبیب یا نسیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تشبیب کی روایت عربی قصیدے میں بہت پرانی ہے۔ جاہلی شعرا کے اکثر قصائد کی ابتدا تشبیب ہی سے شروع ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اُردو غزل، تمام تر فارسی شعروادب کی مرہون منّت ہے، فارسی کے ناقدوں نے غزل کی تعریف میں لکھا ہے کہ "یہ حدیثِ زنان ہے"۔ اس طرح غزل کو عربی تشبیب کے بجائے فارسی شاعری سے منسلک کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

اصطلاح شاعری میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس کے اشعار ہم وزن ہوں، پہلے شعر کے دونوں مصرعے ایک قافیہ میں ہوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ غزلوں کے لئے بحروں کی کوئی قید نہیں، جو رباعی اور مثنوی کا طرۂ امتیاز ہے۔ شاعر کو اختیار ہے کہ جس بحر میں چاہے شعر کہہ سکتا ہے۔

اُردو غزل کی ابتدا، اپنی جانی پہچانی شکل میں وَلی دکنی سے ہوئی ہے۔ وہ دکن کی خاک سے اُردو غزل کی مشعل اُٹھائے دہلی تک آئے اور اسی کے بعد ہی اُردو غزل کی نشوونما کا مرکز دکن سے دہلی کی طرف منتقل ہو گیا اور اسی کے ساتھ اُردو غزل کے ایک نئے دَور کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اُردو غزل کی داستان کے چار ابواب بہت ہی واضح ہیں۔ پہلا باب دکنی غزل سے متعلق ہے جو وَلی دکنی پر تمام ہوتا ہے۔ دوسرا باب اٹھارہویں صدی کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف ۱۸۵۷ء کے انقلاب ناکام کے دور تک محیط ہے۔ تیسرا دور ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے لے کر اقبال کے زمانے تک کا ہے اور آخری باب دورِ جدید سے متعلق ہے۔ مجھے اِس مقالہ کے سلسلے میں دوسرے دور یعنی اٹھارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے نصف تک کے دَور سے براہ راست دلچسپی ہے اِس لئے کہ اِسی دَور میں میرے اس مقالہ کے موضوع حضرت کمالؔ ہیں۔ جو خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کے ہم عصر ہیں۔ میرؔ سے عمر میں تقریباً ۵ سال بڑے تھے۔ وفات ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ لفظ "دریغا" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس لحاظ سے میرؔ سے دس سال پہلے فوت ہوئے۔ اپنے وقت کے صاحبِ رشد و ہدایت بزرگ تھے۔ فضل وکمال اور علم ظاہری و باطنی میں ممتاز تھے، شعروادب میں بھی بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ فارسی شاعری کے علاوہ

اُردو میں غزلوں کا ایک مجموعۂ کلام اور ایک طویل اُردو مثنوی ان کی شعری و ادبی کارناموں کی یادگار ہے۔

اس دَور کی غزل کا مزاج عاشقانہ اور عارفانہ دونوں ہی ہے، عشق و محبت کی واردات کے ساتھ روحانی تصورات کی نمود ملتی ہے۔ اس دور کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو جانے بغیر اس دور کی ادبی و شعری کارناموں کو سمجھنے سمجھانے کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس سے اس دور کے تاریخی و تہذیبی احوال پر بھرپور روشنی پڑتی ہے:۔

"اُس دَور میں صوفیانہ تصورات نمو کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی غزل کی تقلید میں جہاں بہت سے دوسرے موضوعات اُردو غزل میں داخل ہوئے وہاں تصوّف نے بھی راہ پائی، دوسری وجہ یہ ہے کہ خود ہندوستان نے ازمنۂ قدیم میں اُپنشدوں کا وہ فلسفہ پیدا کیا تھا، جس کا احیا نویں صدی عیسوی میں شنکر اچاریہ نے کیا۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود کا داعی تھا، بعد ازاں وشنو بھگتی تحریک نے بھی ذات واحد کے حصول کے لئے صُوفیانہ مسلک ہی اختیار کیا، چنانچہ ہندوستان کی فضا قدرتی طور پر ایرانی تصوف کے نظریات کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھی، تیسری وجہ یہ ہے کہ فارسی شاعری کے علاوہ بہت سے صوفیا یا اُن کے نظریات بھی ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور اذہان پر گہرے اثرات مرتسم کرتے رہے۔ مثلاً خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیریؒ (۱۱۳۶ء تا ۱۲۲۶ء) نے خراسان سے ہندوستان میں آکر تصوف کے چشتیہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ اور بعض دوسرے صوفیا اسی سلسلہ سے متعلق تھے، اسی زمانہ میں شیخ عبدالقادر گیلانی / جیلانی (۱۰۷۷ھ تا ۱۱۶۶ھ) نے ایران میں قادریہ سلسلہ کی بنیاد رکھی تھی، اور مخدوم شیخ محمد نے اُسے ہندوستان میں فروغ دیا۔ نقشبندی سلسلہ کے بانی خواجہ بہاءالدین نقشبندی (۱۳۸۸ء) تھے، اسی سلسلہ کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ نے رواج دیا، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور اُن کے

چار بیٹے اسی سلسلہ کے پیرو کار تھے۔ سہروردی سلسلہ کو حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ (۱۲۳۴ء کے سہرورد ایران) میں قائم کیا تھا۔ ہندوستان کے صوفیا شیخ بہاءالدین زکریا سہروردیؒ، حضرت رکن الدینؒ اور دوسرے اسی سلسلہ سے منسلک تھے۔ خود مغل بادشاہوں کے یہاں صوفیانہ مسلک کی طرف ایک واضح رجحان نظر آتا ہے مثلاً اکبر جب لڑائی میں حملہ کرتا تھا تو "یا معین" کا نعرہ لگاتا تھا۔ شاہ جہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ کا یہ عقیدہ تھا کہ توحید کی واضح ترین صورت ویدانت کے نظریات ہی میں اُبھری ہے، اس نے خود اپنشد کے فلسفے کو اپنی تصنیف "سرالاسرار" میں پیش کیا ہے، اورنگ زیب کی ہمشیرہ جہاں آراء بادشاہ بیگم اور بیٹی زیب النساء بھی تصوف کی طرف مائل تھیں۔ ۱۷۰۷ء میں جب اورنگ زیب نے وفات پائی تو دہلی میں صوفیانہ تصورات کا بڑا رواج تھا، سعداللہ گلشن اور اُن کے رفقاء نے صوفیانہ تصورات کی ترویج میں ایک اہم حصہ لیا تھا، دردؔ کے والد خواجہ ناصر عندلیبؔ بھی صوفی منش تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں وحدت الوجود کے قائل تھے اور دردؔ نقشبندی سلسلہ سے منسلک ہونے کے باعث وحدت الشہود کے مرید تھے۔ ان کے علاوہ اٹھارہویں صدی کے اُردو شعراء عام طور سے تصوف کی طرف مائل تھے اور اُن ایام میں یہ خیال عام تھا کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اِس کے تحت اُردو غزل میں تصوف کا عام رواج ہوا، تاہم اُردو غزل میں صوفیانہ تصورات کی دو سطحیں ہمیشہ موجود رہیں ایک وہ جو شعوری کاوش کی غماز تھی اور جس میں محض رسماً صوفیانہ تصورات کو شامل کر لیا گیا تھا۔ یہ اشعار اثر اور خلوص سے تہی ہیں اور بیشتر اوقات خالص تجریدی رنگ اختیار کر گئے ہیں جو غزل کے بنیادی رجحان سے ہم آہنگ نہیں، لیکن جہاں کہیں صوفیانہ تصورات شخصی تجربے، دردمندی اور شخصیت کے فطری اُبال کے باعث غزل میں در آئے ہیں تو اُن میں نفاست اور نکھار پیدا ہوا ہے اور اُن کا اثر بے پایاں ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ میر دردؔ

کی غزلوں کو بطور خاص بڑی اہمیت حاصل ہے۔"[1]

اور حضرت کمالؒ کی شاعری تو تمام تر اپنے عارفانہ رجحانات اور عاشقانہ رنگ کی آئینہ دار ہے جس میں شخصی تجربے کی گیرائی، یقین کی روشنی اور خلوص، دردمندی پائی جاتی ہے اور اپنے دور کی فکری ترجمانی کے علاوہ، کمالؒ کے ہاں بے پایاں خلوص، تصوف کی عملی تعلیم کے اثرات اور صوفیا کے حقیقی مزاج کی عملی تعبیر نمایاں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تصوف، تغزل سے اب ہم آہنگ ہے کہ اعلیٰ درجے کے ہر غزل گو شاعر کے کلام میں اس کی تھوڑی بہت چاشنی ضرور ملتی ہے۔ توحید کا پرتو اور ذات خداوندی کے مظاہر چونکہ کائنات میں جاری و ساری نظر آتے ہیں اور دُنیا کی ہر شئے میں ذات باری کا جلوہ موجود ہے۔ یہ خیال بجائے خود اپنے اندر شعریت رکھتا ہے اور صوفی شاعر کے وجود کا ہر ذرّہ محبت میں سرشار ہوتا ہے۔ ذات باری کے عشق کی بدولت اس کے دل میں ساری کائنات کی محبت سمائی ہوتی ہے، اس کی روح سے محبت کے جو چشمے پھوٹتے ہیں وہ بلالحاظ مذہب و ملت ساری انسانیت کو سیراب کرتے ہیں۔ محبت کی یہ پُر تاثیر قوت سورج کی روشنی کی طرح دُنیا اور اہلِ دُنیا کو حرارت اور چاند کی روشنی کی طرح ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

تصوف کے مسائل اور مضامین کو اُردو غزل میں شروع ہی سے برتا اور پیش کیا گیا، اس لئے کہ یہ موضوع رمز و کنایہ کے ساتھ خاص طور پر مناسبت رکھتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اور اسلوب تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں تھے، عشق مجازی کے معاملوں کی طرح عشق حقیقی کے واردات و کیفیات کے لئے تغزل کا پیمانہ مناسب اور موزوں خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس لئے تصوف کے اعلیٰ مضامین غزل میں اچھی طرح سموئے گئے ہیں اور تصوف ہی کے سہارے علم و حکمت اور دانائی نے بھی ایوانِ غزل میں جگہ پائی ہے۔ حافظ سے لے کر غالب تک غزل کے پیمانہ میں جس طرح علم و حکمت کے اسرار و رموز بیان کئے گئے ہیں اس سے اُس دور کا ذہنی ارتقاء شعری نکات کی شکل میں نمایاں نظر آتا ہے۔

---

[1] اُردو شاعری کا مزاج از: ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶

غزل، جذبہ کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ لیکن جذبے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کے جذبات جس کا سینہ علوم و معارف اور روحانیت کی روشنی سے منور ہو اور اس شخص کے جذبات جو مادّی و حیوانی زندگی کا رسیا ہو، دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کا اثر غزل گو شعراء کے کلام پر ہمیشہ پڑا ہے اور آئندہ بھی پڑتا رہے گا۔

اُردو غزل میں میر درد کا کلام ہو یا حضرت کمالؔ کی شاعری، دونوں کے یہاں عشقِ حقیقی کا رنگ نمایاں ہے لیکن وہ تغزل اور شریعت کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، ان کے کلام میں ایک خاص رنگ اور انفرادیت پائی جاتی ہے وہ اپنے روحانی تجربوں کو نرم اور آہستہ سُروں میں بیان کرتے ہیں جو ان کی قلبی کیفیتوں اور اخلاص کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام میں تصوّف، تغزل سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ لفظوں کی گھلاوٹ نے معنوی حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ دردؔ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تہمتیں چند اپنے ذمّہ دھر چلے ‏ کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ‏ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا ‏ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ‏ ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

اور چند شعر حضرت کمالؔ کے بھی ملاحظہ ہوں تصوّف و تغزل کا کیسا نقطۂ عروج ہے ؎

اُلٹا پھروں ہوں دشت میں جیوں گردِ کارواں ‏ منزل کہیں ہے راہ کہیں، راہ بر کہیں
عاشق کو کب ہوے ہے عزیز اپنا سر کہیں ‏ اس کو نہیں ہے خوف کہیں اور خطر کہیں
ملتی نہیں ہے یار کی مجھ کو خبر کہیں ‏ جاوے ہے دل کہیں و پریشاں نظر کہیں

کبھی جو مہر جبیں بے نقاب ہو جائے ‏ ہر ایک ذرّہ وہیں آفتاب ہو جائے۔

غزل گو شعراء میں حضرت کمالؒ کا مقام

ولی سے غالب تک کا دور اُردو غزل کے فروغ اور عروج کا زمانہ رہا ہے۔ اس سارے عرصہ میں غزل اپنی تمام روایت کے ساتھ ترقی کرتی رہی، فن میں وسعت اور پھیلاؤ ہوا اور فکری و ذہنی سطح پر نئی اُفق کی تلاش جاری رہی۔ اُردو غزل کی روایت بنیادی طور پر فارسی غزل سے مستعار ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس نے تلمیحات، استعارات، تراکیب اور فکر و خیال کے مخصوص پیکر بھی فارسی ہی سے مستعار لئے اور انہیں کام میں لاتی رہی۔ اس طرح یہ پورا دور اُردو غزل کے ارتقاء کا رہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آغاز ہی میں ہندوستان کی فضا میں انقلابی تبدیلیاں شروع ہوئیں، انگریزی حکومت کے تسلّط اور مغربی تہذیب و ادب کے نفوذ نے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ تحفّظ ذات کے ساتھ تحفّظ ادب و تہذیب کے جذبات اُبھرے اور ساری ہندوستانی قوم ذہنی، تہذیبی اور سیاسی طور پر بیدار ہوگئی، اس کے اثرات ادب و شاعری پر بھی پڑے، جس کے اثرات ہمیں اس پورے دور میں ملتے ہیں۔

حضرت کمالؒ کا دور اُردو شاعری کا گو ابتدائی دور تھا لیکن ذہنی و فکری بالیدگی اور سیاسی و معاشرتی تبدیلی، جس طرح تیزی سے وقوع پذیر ہو رہی تھی اس کے اثرات دہلی سے عظیم آباد تک یکساں پڑ رہے تھے۔ سیاسی انتشار کی وجہ سے مسلمان حکومتوں کا استحکام جاتا رہا تھا؛ ہر آن ایک نئی تبدیلی کا خطرہ تھا۔ اِس چیز نے شعر و ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا اور یہ ایک عجیب بات نظر آتی ہے کہ اس دور میں دہلی اور عظیم آباد جو سیاسی اور علمی و ادبی دونوں ہی حیثیتوں سے پورے ملک کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتے تھے وہاں شعر و ادب کے انداز میں بڑی مماثلت اور یکسانیت ملتی ہے۔ معاصرین شعراء کا نقطۂ نظر عموماً صوفیانہ ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے اکثر اہلِ دل بزرگ ہیں۔ جن کے یہاں "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کا مصداق نہیں بلکہ توحید کا تصور اور عشق الٰہی کا جذبہ اُن کی زندگی کی عملی تفسیر تھی۔

اللہ سے محبت کے نتیجہ میں خلق اللہ سے انہیں محبت تھی۔ اور خلق اللہ کی خدمت کو وہ بہترین عبادت تصور کرتے تھے۔ خدا کے جلوے میں اُنہیں ساری کائنات کا وجود و ارتقار نظر آتا تھا اور نوعِ انسانی کو اسی محبت الٰہی کا وہ امین سمجھتے تھے۔ اس طرح ساری انسانیت کی محبت کے وہ نشان بن گئے تھے۔ اس دَور کے شعرار جو متصوفانہ تصورات کے حامل تھے، اُن کی شاعری میں عشق و محبت، دل سوزی و دردمندی، آفاقیت و انسانیت کے اعلیٰ جذبات پائے جاتے ہیں۔

حضرت کمالؔ دبستانِ عظیم آباد سے وابستہ تھے۔ دبستانِ عظیم آباد اور دلّی اسکول میں بڑی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اِن دونوں دبستان کی مماثلت کے جہاں فنّی اسباب ہیں وہاں ذہنی و فکری اثرات بھی یکساں تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقار" میں اُن حالات پر روشنی ڈالی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

> "دبستانِ عظیم آباد، دِلّی اسکول سے مماثلت ضرور رکھتا ہے مگر اس مماثلت کی وجہ اتنی سطحی نہیں کہ دہلی سے شعرار عظیم آباد آئے اور اُن کا اثر پڑا یا یہاں کے شعرار دِلّی گئے، اور وہاں کی نقالی کرنے لگے۔ دہلی کا اثر سارے مراکزِ اُردو پہ ملک بھر میں پڑا ہے، عظیم آباد اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن دلّی اور عظیم آباد میں مماثلت، فن کے اسباب اس اثر و تاثر کے علاوہ بھی ہیں۔ تاریخی وجوہ سے دہلی اور پٹنہ کی فضا ایک جیسی تھی، زندگی اور اس کا ماحول ایک جیسا تھا، دہلی میں اگر حملہ نادر و ابدالی اور سکھ و مرہٹہ کی بغاوت و یورش کی وجہ سے سماج اور حکومت کی بنیادیں ڈانواڈول تھیں، اور عام یاس و حسرت، درد و اضمحلال جاری و ساری تھا تو پٹنہ پر بھی بنگالہ سے انگریزوں کی سازشوں اور حملوں نیز مرہٹہ گردی کا عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔ زندگی بے چین و دردمند تھی، ان دونوں کے درمیان لکھنؤ ایک جزیرہ تھا، عارضی طور پہ رومان پرور، مگر پٹنہ اور دلّی کا ایک حال تھا۔

ایک جیسے ماحول میں دونوں مقاموں کے فن کاروں کا ایک جیسا ردعمل بھی ہوا، فن کاروں کی انفرادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عظیم آباد اسکول کے فن کاروں میں داخلیت اور درد و سوز، یاس و حسرت اُنہیں اسباب زندگی سے پیدا ہوئی جن اسبابِ حیات سے دبستان دہلی میں وجود آئی تھی اور یہ اسباب نقالی تھے۔ عظیم آباد اسکول کے فن کاروں کے اخلاص، تجربہ اور صداقت فن کی دلیل اُن کے کلام کی تاثیر ہے۔[۱]"

اِس پس منظر میں اگر حضرت کمالؔ کی شاعری کا تجزیہ اُن کے ہم عصر غزل گو شعراء کے درمیان کیا جائے تو حضرت کمالؔ کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت اور اُن کے حقیقی مرتبہ و مقام کا اندازہ ہو سکے گا۔

دبستانِ دہلی کے مشہور شاعر حضرت مظہر جان جاناں (۱۱۱۳ھ - ۱۱۹۵ھ) حضرت کمالؔ کے دور کے نمایاں شاعر ہیں۔ خود بھی مشہور صوفی بزرگ تھے اور متصوفانہ شاعری کی تمام خصوصیت اِن کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی معنویت ہے جو کچھ انہوں نے دیکھا، سوچا اور محسوس کیا سب کی تصویریں اُن کے اشعار میں ملتی ہیں۔ اُن کے جذبات و افکار، بے نقاب نظر آتے ہیں، عشقیہ موضوعات پر اُن کے واردات، احساسات اور کیفیات کا اظہار اُن کی شاعری میں بہت زیادہ ہے، جن میں اُن کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ تصوف سے گہری وابستگی نے مرزا مظہر کے کلام میں وسعتیں بھی پیدا کی ہیں۔ عشقیہ شاعری کی معنویت، معرفت و حقیقت سے تعلق رکھتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلہ کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

---

[۱] بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء : ڈاکٹر اختر اورینوی صفحہ ۱۹۰

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشمِ تر سے مینہ نہ برساتی

اُدھر نگہ کی تیغ اِدھر آہ کی سناں
اِس کش مکش میں عمر ہماری بھی کٹ گئی

وقت ہے ماہ رو کے آنے کا
فکر کر شمع کے بجھانے کا

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

اِن اشعار میں وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ عشق ہے اور زندگی کی بے ثباتی کا اظہار ہے، داخلیت اور سوز و گداز ہے۔ جس کے بغیر تغزل کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں کے کلام میں غزل کے فن کا اعلیٰ نمونہ ملتا ہے اور اس میں وہ تمام عناصر اور لوازم موجود ہیں جن سے صنفِ غزل کی فنی تشکیل ہوتی ہے۔

دوسرے ہم عصر شاعر خواجہ میر دردؔ (پیدائش ۱۱۳۱ھ) ہیں، جن کی شاعری غزل تک محدود ہے۔ اِس محدود دائرے میں رہ کر انہوں نے غزل کو وسیع اور اس میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کی۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تغزل کے مخصوص رنگ و آہنگ کو باقی رکھا ہے اور حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اپنے انداز سے کی ہے۔ خواجہ میر دردؔ بھی اپنے زمانہ کے مشہور صوفی اور اہلِ دل بزرگ تھے، تصوف اُن کا خاص میدان تھا۔ زندگی بھر وہ راہِ طریقت کے مسافر رہے، اُن کی شاعری اُن کی شخصیت کی صحیح آئینہ دار اور اُن کے ماحول کی سچّی ترجمانی ہے۔ میر دردؔ صوفی ہونے کے باوجود زندگی سے بیزار نہیں تھے، تصوف کو وہ ایک نظامِ حیات سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اُن کے یہاں زندگی کی نفی نہیں کرتا اور اس سے بیزار ہونا اور منہ موڑنا نہیں سکھاتا۔ دوسری طرف اُن کے یہاں داخلیت ملتی ہے، وہ حسن کا ایک داخلی تصور رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں حُسن و عشق کے وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ دل بہت نمایاں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب نظر سے بہار گذرے ہے　　جی پہ رفتارِ یار گذرے ہے

وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں　　برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں

دل کس کی چشمِ مست کا سرشار ہوگیا　　کس کی نظر لگی جو مجھے پیار ہوگیا

اِیدھر کو جو مُسکرا کے دیکھا　　کچھ تو جی سے حجاب نکلا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں　　تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو　　میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

میر درد کا عشق انسانی زندگی کی ایک داستان ہے۔ اسی داستان میں عرفان و معرفت اور محبت الٰہی کا رنگ نمایاں ہے۔ "تصوف" بجائے خود میر درد کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور اس کی بڑی گہری چھاپ اُن کی غزلوں میں ملتی ہے ؎

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب، کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا، واں بھی شہود تیرا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

دلبستان دہلی میں حضرت کمالؔ کے تیسرے ہم عصر شاعر میر تقی میرؔ ہیں، جن کی شاعری

اُردو شاعری میں مہرِ منیر بن کر چمکی، بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی :-

"اُن کی شہرت، ناموری اور مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ اُنھوں نے شاعری کو درد اور درد کو شاعری بنا دیا ہے۔ دوسرے شاعروں کے یہاں شاعری میں درد تو ہو سکتا ہے یا درد بھری شاعری تو ہو سکتی ہے لیکن خود درد کو شاعری بنا دینے کا سہرا میرؔ ہی کے سر ہے۔" [۱]

غرض میرؔ سرتاپا درد و غم اور رنج والم ہیں اور اُن کی شاعری بھی شروع سے آخر تک اسی درد و غم اور رنج والم کی تصویر ہے۔ میرؔ کی شاعری درد و غم اور رنج والم کی ترجمانی اور عکاسی کے باعث سوز و گداز اور نشتریت سے بھرپور ہے۔

میرؔ کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت، اُن کی آفاقیت اور انسان دوستی ہے۔ اُن کی شاعری حد درجہ داخلی ہونے کے باوجود، اپنی انفرادیت رکھتی ہے، اُن کی شاعری میں عام انسانوں کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں، اُن کی شاعری میں انسان ہے اور اور انسانیت کی آواز ہے اسی لئے اس میں آفاقیت کا رنگ نمایاں ہے۔ میرؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی غزل سرائی کی ہے، اس میں آب و رنگ دیا ہے، گرمی اور روشنی پیدا کی ہے۔

میرؔ کی شاعری کے اعلیٰ معیار ہیں۔ اُن میں زندگی کی بلند اخلاقی قدریں ہیں۔ صداقت پاکیزگی اور عشق کے اعلیٰ جذبات ہیں اسی چیز نے میرؔ کی غزل کو اعلیٰ معیار اور فن عطا کیا، روشنی اور حرارت بخشی۔ میرؔ کی زندگی عشق عبارت ہے اور غزل عشق کی مرہون منت ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرؔ اور غزل کچھ اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے کہ پھر میرؔ کے جوہر غزل ہی میں کھلے اور غزل بھی میرؔ کے یہاں اپنی جوہر دکھاتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں جن سے میرؔ کی شعری خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ بدن نزار تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

---

[۱] شاعری اور شاعری کی تنقید : از ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۱۵۷

یوں ہی حیران و خفا، جوں غنچۂ تصویر ہوں　　عمر گذری پر نہ جانا یہ کہ کیوں دل گیر ہوں

میر صاحب رُلا گئے سب کو　　کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

گذر سر سے تب عشق کی راہ چل　　کہ ہر گام یاں ایک خطرگاہ ہے

عشق میں بے خوف و خطر چاہئے　　جان دینے کو غزالوں کا جگر چاہئے

یادِ اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　ناداں پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائیگا

دور بہت بھاگو ہو، ہم سے سیکھے طور غزالوں کو　　وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

حُسن و عشق کے تصوّر اور رنج و غم کے جذبہ کے ساتھ میر کے یہاں تصوف کے اثرات بھی خاصے گہرے ہیں، اُن کے یہاں جگہ جگہ عشقِ حقیقی کا تصوّر اور محبتِ الٰہی کا جلوہ بھی نظر آتا ہے۔

۱　　ےہ　　کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا یاں خدا ہے عشق

حضرت کمالؔ. جو اصلاً دبستان عظیم آباد سے وابستہ تھے۔ اُن کی تعلیم و تربیت اور شاعری کے عروج میں عظیم آباد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اِس دَور میں دبستانِ عظیم آباد کی شاعری میں صوفیانہ مذہبی رنگ غالب تھا۔ غزلوں میں عارفانہ میلان نمایاں ہے اور عشقِ حقیقی کے پس منظر میں عاشقانہ رنگ کی نمائندگی بھی ہوتی رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اِس دَور میں عظیم آباد کے

پورے دبستان شاعری پر صوفیا اور دینی شخصیتوں کا اثر رہا ہے۔

حضرت کمالؒ کے بہاری معاصرین میں شاہ آیت اللہ جوہری پھلواروی ۱۱۲۶ھ / ۱۲۱۰ھ معروف اور نمایاں شخصیت رہے ہیں۔ صاحب رشد و ہدایت بزرگ گزرے ہیں۔ مراثی و مثنوی میں خصوصیت حاصل تھی، اُردو غزلیں انھوں نے بہت کم لکھیں۔

شیخ غلام یحییٰ حضورؔ (۱۲۰۶ھ) آپ کا شمار بھی عظیم آباد کے مشائخ میں تھا، مریدین و معتقدین بہ کثرت تھے، شعروادب سے فطری مناسبت تھی، غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو یوں آپ بیرونِ در جائیں گے
خدا جانے کس کس کے گھر جائیں گے
مُسافر ہیں لیکن نہیں جانتے
کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے

آبرو اُلفت میں اگر چاہیے
رکھیے سدا چشم کو تر چاہیے
دل میں جواہر ہے لیکن حضورؔ
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

شاہ نورالحق تپاںؔ پھلواروی ۱۱۵۶ھ / ۱۲۳۴ھ اپنے زمانہ کے مشہور صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں۔ شعروشاعری میں کمال حاصل تھا، صاحب دیوان ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوش والوں سے جو سُنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا مُنہ پھیر کے ہنستا ہے دِوانہ تیرا
عقل کو چھوڑ دیا تونے تو ہشیاری کی
پڑ گیا نام تپاںؔ کیونکہ دوانہ تیرا

اک خواب سے بڑھ کر نہیں یہ ہستی موہوم
وہ خواب جو شرمندہ ہے تعبیر کے آگے

تیرے عاشق تیرے شیدا کا یہ حال
ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے
منزلِ مقصود پاوے ہے وہی
جو تیرے رستہ میں کھویا جائے ہے

بتکدے میں تم پہ کیا گذری تپاںؔ بتلاؤ تو　　بیٹھ کر مسجد میں کیوں یادِ خدا کرنے لگے

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۸ھ) اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ فدویؔ کے شاگرد تھے اور میر تقی میرؔ سے عقیدت تھی ان کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ تصوف کا رنگ بہت نمایاں ہے جو اُس دَور کا طرّہ امتیاز ہے۔ راسخؔ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　پلک پر اپنی آنسو، صبح پیری کا ستارا ہے

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا　　آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

بے مدعا ہوں، یہ بھی ہے اک مدعائے دل　　اس قیدِ مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں　　لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں
دل کیوں نہ عزیز مجکو ہووے　　ہے نام تمہارا اس نگر میں

دہلی و عظیم آباد کے اِن باکمال شعراء کے جھرمٹ میں شعر و ادب کا ایک تابندہ ستارہ عزلت و گمنامی کے بادل میں چھپا تھا۔ جس کی شعری و ادبی کرنیں قلمی مسودوں کی صورت میں محفوظ الماری میں مقید تھیں۔ حالانکہ شعر و ادب کی بھری محفل میں وہ تنہا تھا۔ میری مراد حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی سے ہے۔ جنھوں نے آج سے دو سو برس پہلے ایک صوفی خانوادہ میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد علوم و فنون کی تکمیل عظیم آباد میں کی اور علم و فضل سے بہرہ ور ہوکر، روحانی علوم کی تکمیل اپنے نانا شاہ غلام علی دیورویؒ سے کی اور پھر پوری زندگی تصوف و احسان کے منازل طے کرنے اور مخلوق خدا کی خدمت و ہدایت میں گذاری۔ اس طرح اپنے ایمان و یقین کی روشنی سے عام انسانوں کے اندر اُجالا پھیلاتے اور دلوں کو گرماتے رہے۔ حضرت کمالؒ خود ایک بلند پایہ صوفی تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں صوفیانہ تصورات کی فراوانی ہے مجاز سے حقیقت اور کثرت سے وحدت کی طرف پیش قدمی ہے۔ روح اور جذبہ کے

امتزاج سے ان کی شاعری میں زندگی آئی ہے، عشق کا اعلیٰ تصور ہے۔ جس نے شاعری اور زندگی دونوں میں بلندی پیدا کی ہے۔ عشق کو پاکیزگی بخشی اور عشق میں برگزیدگی عطا کی ہے۔

حضرت کمالؒ اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب سارا ہندوستان تہذیبی اور اخلاقی طور پر روبہ زوال تھا، اذہان پر تالے پڑے تھے، سوچنے سمجھنے کی راہیں بند تھیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدریں ٹوٹ رہی تھیں، مذہب تجارت بن چکا تھا اور مذہب کے نام پر ریاکاری نے ہر شئے پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ اس گھٹن کی فضا میں حضرت کمالؒ کی حیثیت علم و دانش کے روشن مینار کی تھی جس کی روشنی سے سرزمین بہار منور تھا، اُن کے لئے شاعری کوئی ذریعۂ عزت نہ تھی بلکہ عوام کی زبان میں شاعری کو وسیلۂ ہدایت بنایا تھا اس حیثیت سے حضرت کمالؒ اپنے فن اور مقصد دونوں میں کامیاب ہیں۔ اُن کے جذبات صادق اور حکیمانہ افکار شعر کے سانچہ میں موتیوں کی طرح ڈھل گئے۔ ان شعری موتیوں کی آب و تاب میں امتدادِ زمانہ کے باوجود اب بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ چمک مدھم ہوئی ہے ـــــ کلام کمالؒ میں یوں تو بیسوں اشعار ملیں گے جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں حکمت و بصیرت بھی ہے اور شعری دل کشی بھی۔

ایک مکمل غزل دیکھئے ؎

دیکھا ہے نخل آہ کے تیئں بے ثمر کہیں
دیکھا کس کے سینے میں اپنا جگر کہیں

اُڑتا پھروں ہوں دشت میں جیوں گرد کارواں
منزل کہیں ہے راہ کہیں، راہ بر کہیں

مارا پڑا ہے آج تلک نامہ بر کہیں
کس نے کبھی سنا ہے ستم اس قدر کہیں

اب میں چلا ہوں ہاتھ پہ رکھ اپنے سر کے تئیں
لیکن نہ ہو قبول میرا سر اگر کہیں

کہنے لگے جو دل سے مرے دوستدار بھی
آتا ہے اضطراب کوئی اس قدر کہیں

عاشق کو کب ہوسے عزیز اپنا سر کہیں
اس کو نہیں ہے خوف کہیں اور خطر کہیں

ملتی نہیں ہے یار کی مجھ کو خبر کہیں
جاوے ہے دل کہیں و پریشاں نظر کہیں

گذری ہے سر پہ میری قیامت کے سب کمالؔ
رل جاوے صبح ہوتے ہی شمشیر و سر کہیں

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

کبھی جو مہر جبیں بے نقاب ہو جائے | ہر ایک ذرہ وہیں آفتاب ہو جائے
بیاں میں حالِ پریشاں میرا کہاں آئے | یقیں ہے قطرے میں کب بحرِ بیکراں آئے
کھڑا ہے قافلہ حیرت سے مثلِ سنگ نشاں | خدا کرے کہ ابھی میرِ کارواں آئے

کبھی جو اہلِ بصیرت کی اک نظر ہو جائے | جو بے ہنر ہو وہی صاحبِ ہنر ہو جائے

گر نقاب اس رُخِ روشن سے کبھی گر جائے | بامِ گردوں سے خجل ہو، مہِ تاباں گر جائے

میں اُس بُت کافر کا برہمن نہیں تنہا | اب دیر نشیں ہو گئے سب کعبہ نشیں بھی

اب کہاں تابِ انتظار کی ہے | مجھ پہ اک لحظہ سو قیامت ہے

صدا جرس کی نہیں پہنچی آج تک مجھ کو | میں گردِ راہ ہوا، میرِ کارواں کی قسم

ہجر کا کیا عذاب ہوتا ہے | آہ، دوزخ کا کچھ عذاب نہیں

سرزمین بہار کا یہ گمنام مگر باکمال شاعر اپنی شعری و ادبی کارناموں میں اپنے معاصرین سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن اخفا اور سترِ حال کے صوفیانہ اصول کے پیشِ نظر یہ درّہائے شعر و ادب عرصہ سے زینتِ المماری بنے تھے۔ حالانکہ حضرت کمالؒ کی شاعری اپنے اندر یقین کی روشنی، فکر کی تابانی اور زبان کی شیرینی و دل کشی کا ایک حسین امتزاج رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت کمالؒ کا کلام ایک ایسا سدا بہار گلدستہ ہے جس میں تصوف و احسان، حکمت و اخلاق اور زبان و ادب کے رنگا رنگ پھول

رکھے ہیں۔ جن کی تروتازگی اور شادابی میں امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے، آپ کے اشعار میں عصر حاضر کی روح، زبان و بیان کی دل آویزی اور جدید دَور کی شاعری کی تب و تاب سب کچھ موجود ہے۔ اور زبان کے بعض متروک الفاظ سے قطع نظر اِن میں فکر و خیال کے جگنو چمکتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اچھی شاعری کی تخلیق ہی نہیں کی بلکہ اچھی شاعری کے تخلیقی امکانات کو روشن کیا۔

حضرت کمالؒ کی غزل گوئی کے عناصرِ ترکیبی

حضرت کمالؒ ایک عظیم شاعر تھے اور غزل گوئی کے فن میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اُن کی شاعرانہ عظمت کا اصل راز، اُن کی وہ اخلاقی روحانی بلندی ہے جسے ہم ایمان ویقین کہتے ہیں۔ اُن کی شاعری اُن کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی شخصیت میں جو روحانی عظمت تھی، اس چیز نے اُن کی غزل گوئی میں گوناگوں اور رنگارنگی پیدا کر دی تھی اور جس نے اُن کو اپنے ہم عصروں میں دل آویز، جاذب نظر اور باعث کشش بنا دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں زبان کی خوبی، انداز بیان کا بانکپن، سادگی وروانی کے ساتھ فکروخیال کی بلندی، سوزوساز، دردوتپش اور جاذبیت وکشش نظر آتی ہے۔ حضرت کمالؒ کے علمی فضائل اور شعری کمال کا اصل سبب دراصل اُن کا خاندانی ماحول، روحانی فضا اور رشد وہدایت کا تربیتی مرکز تھا جہاں آپ نے تعلیم وتربیت حاصل کی، پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ وہ ایک ایسا علمی ماحول اور روحانی مرکز تھا، جہاں آپ کی ذہنی، فکری، شعری وادبی تعلیم وتربیت ہوئی جو ہر کس وناکس کو میسّر نہیں ہوتا، ایسے روحانی مراکز سے صرف ائمۂ فن، مجتہدینِ فکر اور مجدّد دینِ امّت ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جس داخلی مدرسہ میں آپ نے تعلیم پائی، اور روحانیت کی تکمیل کی وہ حقیقتاً دل کا مدرسہ تھا، ضمیر ووجدان کا مرکز تھا۔ جہاں روحانی ارتقا اور الہٰی تربیت ہوتی ہے۔ ایسے ماحول اور فضا میں جس شخصیت نے اپنے کو بنایا، سنوارا اور پروان چڑھایا ہو اس کی شخصیت کی دل آویزی اور اس کے شعروادب کی دل کشی کا کیا پوچھنا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت کمالؒ کی غزلوں میں دردوسوز، تب وتاب، عشق کی بجلیاں اور یقین کی تجلیاں سب کچھ موجود ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر کی عظمت کا راز اس کے فنی کمال اور ادبی ریاض میں ہے یہ صفات شاعر کے صرف صوری حسن کی عکاسی کرتے ہیں لیکن عظیم شاعر تو وہ ہے جس کا اندروں تابناک ہو اور

جس کی داخلی کیفیت اور جذبہ شعر کے سانچہ میں ڈھل کر اپنے اندر آفاقی اور دوامی حسن پیدا کرتا ہے اور ایسے ہی شاعر کے لئے بقائے دوام ہے ۔

حضرت کمالؒ کے فن کی اصل خوبی "اُن کا ایمان و یقین" ہے ۔ اُن کی شاعری کا منبع اور سرچشمہ اُسی جذبۂ ایمانی سے پھوٹتا ہے ۔ خدا پر یقین، آخرت کا تصور، رسول اور اصحاب رسول کی محبت، یہ وہ عناصر ہیں جن سے حضرت کمالؒ کی شاعری کا خمیر تیار ہوتا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

گر عزم کرے اس کی تجلّی کے بیاں کا
روشن ہی جلے شمع صفت تازہ بیاں کا

آہ ایماں سے اس قدر گذرا
کفر پر میرے برہمن رویا

ہر چند کہ دل خستہ ہوں راضی ہوں رضا پر
گو خونِ جگر کھاتا ہوں شاکر ہوں قضا پر

غافل نہ ہو کمالؔ ٹک اک چشم کھول دیکھ
ہے آخرت کے دشت میں جوئے سراب عمر

کہا نبیؐ نے علی سوں یقین کر جانو
جہاں میں نہ ہوگا شیر کے مانند

ہر لحظہ صلوٰۃ اور سلام اپنے دلوں میں
بھیجے ہیں ملائک سر اقلیم رضا پر

جو آنکھ ہو تو دیکھو قیامت پلک میں ہے
ہر دم اُڑے ہے پتّہ صفت کو ہسار عمر

یہ چند نعتیہ اشعار اپنی مثال آپ ہیں ؎

سو ٹکڑے جگر اس کا ہو مانند کتاں کے
مہتاب جو دیکھے کبھی اس مہر جبیں کو
اس کاکل مشکیں میں جو ہے بوئے دل آویز
یہ بوئے دل آویز کہاں نافۂ چیں کو

کبھی سُنا نہیں تو نورِ لامکاں کے تئیں   وطن تو سمجھے ہے اس تیرہ خاکداں کے تئیں

جناب حضرت دل عرش کبریا دیکھو   خودی سے اپنی گذر خانۂ خدا دیکھو

سخن میں اس کی اثر ہو نفس منظر ہو   زباں پہ جس کی کبھی شہ کا پاک نام آوے

یہ چند اشعار بطور نمونہ ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ کلام کمالؔ کا ہر شعر اپنے اندر یقین کی روشنی اور محبت کی گرمی سے مالا مال ہے۔

حضرت کمالؒ کی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دل ایک ایسی کتاب کی روشنی سے منوّر ہے، جس کی کرنیں چھن چھن کر اس کے کلام پر پڑ رہی ہیں۔ میری مراد قرآن مجید سے ہے، جو ایک ایسی زندہ جاوید کتاب ہے جو انسان کو ابدی علم اور ابدی سعادت سے بہرور کرتی ہے۔ حضرت کمالؒ کی شاعری پر اس عظیم کتاب کا اثر مختلف حیثیتوں سے اُجاگر ہے لیکن قرآن کا بحرِ بیکراں شعر کے قطرے میں بیان ہونے سے قاصر ہے ع

یقین کے قطرے میں کب بحرِ بیکراں آئے

افسوس کہ آج خود مسلمان اس کی روشنی سے محروم اور اس کے علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں، حضرت کمالؒ کی زندگی پر اس عظیم کتاب ہی کا اثر تھا، جس نے انہیں وہ حقیقی روحانی عظمت اور رشد ہدایت کا وہ مرتبہ و مقام بخشا۔

حضرت کمالؒ کی شاعری کی عظمت اور دلکشی و دل آویزی پیدا کرنے میں ان کی شخصیت کا وہ حسن ہے۔ جنھیں ہم "عرفان نفس" کہتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا یہ قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ کے آپ مصداق تھے جب تک آدمی میں عرفان ذات نہ ہو اس وقت تک زندگی میں حقیقی سوز و مستی اور جذب و شوق پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت کمالؒ کا کلام اُسی سوز و ساز اور جذب و شوق کا آئینہ دار ہے یہ حضرت کمالؒ کی خود شناسی اور خود آگاہی نے اُن کے اندر پیدا کر دی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شیریں سخن وہی ہیں، جو کوئی پختہ فکر ہیں　　ترش دلیل خامی ہے یعنی ثمر کے بیج

ملے جو مردم بینا سوں اہلِ چشم کوئی　　پلک میں پہنچے فلک پر نگاہ کے مانند

قافلہ، کارواں کی کیا حاجت　　راہ دل میں ہے، رہنما کی قسم

جو دل گداز ہو روشن ہو وقت پیری کے　　سحر کو شبنمِ گلزار مہرتاباں ہو

گر مری آہ دردناک سُنتے　　گر پڑے عیسیٰ آسماں روئے
گر مری رشک سیل کو دیکھے　　دشت میں میر کارواں روئے
گر مری آہ آتشیں کو سنے　　باغ جل جاوے باغباں روئے

حضرت کمالؒ کی غزل گوئی کی سب سے اہم خصوصیت اُن کا عشق و محبت ہے۔ اُن کے عشق حقیقی اور محبت الٰہی نے اُن کی غزلوں میں درد و داغ اور سوز و ساز پیدا کر دیا۔ اُن کی شاعری رستے ہوئے قلب، پُر جوش و پُر سوز دل کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے وقت کے نرے شاعر و ادیب نہ تھے بلکہ عرفان و سلوک کی اس منزل پر تھے جو مشاہدۂ حق کی منزل ہوتی ہے اور اس چیز نے اُن کی شاعری میں نت نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کی۔ حضرت کمالؒ کا دور مغل دور کے جاگیردارانہ نظام کا زوال پذیر دور تھا۔ مادیت اور عیش و عشرت اس دور کا مزاج بن گیا تھا، اس مادیت اور عیش و عشرت کا علاج حضرت کمالؒ کے نزدیک روحانی و اخلاقی اقدار اور عشق و محبت کی راہ تھی، دنیا طلبی اور مادی عیش و نشاط کا زنگ عشق کی بھٹی ہی میں صاف ہو سکتا تھا۔ حضرت کمالؒ نے اپنی شاعری کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کی کوشش کی اور لوگوں کے درمیان دنیا کی عارضی و فانی لذت کے مقابلہ میں آخرت کے ابدی آرام اور دائمی سکون کی طرف رہنمائی کی ؎

جز مشتِ خاک کچھ نہ رہے گا نشانِ عمر
ملکِ عدم کو جاتا ہے یہ کاروانِ عمر

عشق و محبت کی راہ میں جو لذت اور ساتھ ہی کلفت و ذلت ہے اس سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہے جس نے اس وادیٔ پُر خار میں قدم رکھا ہو اور جس کے قدم لہو لہان ہوئے ہوں۔ اس راہ کی رسوائی کی کتنی اچھی تصویر اس شعر میں پیش کی ہے ؎

تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد — کہیں کسی کو محبت میں ننگ نام رہا

جہاں کہ داغِ محبت ہے خیلِ غم واں ہے — جہاں کہ آگ نہ ہو قافلہ وہاں نہ رہے

ہجر کا کیا عذاب ہوتا ہے — آہ دوزخ کا کچھ عذاب نہیں

حضرت کمالؒ کا عشق مادی نہیں بلکہ روحانی ہے اس سے ذہنی آسودگی، قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ عشق کا یہ صحت مند تصور اس دور میں ہمیں صرف اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے دو سو برس پہلے کے اس صوفی شاعر کے بعض اشعار میں اقبال کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے جس میں درد بھی ہے اور کسک بھی۔ وہ خود بھی تڑپتے ہیں اور دوسروں کو بھی تڑپاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی غزلیں ہمارے دل کی گہرائیوں کو چھوتے اور متاثر کرتے ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خاکِ تربت کو دیکھ کر میرے — سر پٹک میر کارواں رویا
سُن کر افسانہ میری رقت کا — آہ کر میرا انجمن رویا
آہ میری کوں سُن کے گلشن میں — گر پڑا سرو باغباں رویا

رقتِ دل سے میرے آہ کمالؔ
بہ گئے باغ، باغباں رویا

پڑی ہے غم کے تلاطم میں صبر کی کشتی   عبور کیوں کہ کروں بحرِ بیکرانِ فراق

کس کو خبر ہے آہ، میرے داغِ عشق کی   خاموش ہو کہ جلتا ہے یعنی کبابِ دل

جو داغِ عشق اس کو کہو یا کہ کچھ کہو   رکھتا ہے اپنے جیب میں ایک آفتابِ دل

ایک داستانِ عشق ہے یعنی کتابِ دل   نازک ہے بوئے گل سے بھی یعنی دماغِ دل

عاشق کو کب ہوئے ہے عزیز اپنا سر کہیں   اِس کو نہیں ہے خوف کہیں اور خطر کہیں
ملتی نہیں ہے یار کی مجھ کو خبر کہیں   جاوے ہے دل کہیں اور پریشاں نظر کہیں

مرنے کے بعد بھی نہ گیا دل کا اضطرار   تڑپے ہے آج تک مری خاکِ مزار دیکھ

لکھا ہے خونِ جگر سے میں اپنے دیواں کو   عجب کہ روئے زمیں پر یہ داستاں نہ رہے

حضرت کمالؔ کی غزلوں کے اجزائے ترکیبی کے ان خالص اجزاء کے علاوہ، چند اور داخلی عناصر بھی ہیں جن کے نور سے حضرت کمالؔ کی شاعری منوّر ہے اور جن کی خوشبو سے آپ کا سارا چمنِ شاعری معطر ہے۔

داخلی عناصر دبستان دلی اور عظیم آباد دونوں ہی کی سب سے بڑی خوبی یہی رہی ہے کہ اُن کے یہاں داخلیت کا عنصر زیادہ رہا ہے، اس کی وجہ وہ سیاسی و معاشرتی حالات ہیں جن سے اس وقت پورا ملک گذر رہا تھا، اجتماعی زندگی کے انتشار نے انفرادیت کو جنم دیا۔ لیکن اس دور کے صوفیائے کرام نے اس انفرادیت کو حقیقتاً اجتماعی اصلاح کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا اس دور کے اکثر اردو شاعر صوفی تھے اور تصوف اُن کا مسلک و

مشرب تھا اور حقیقتاً یہ رابطہ عوام کا ذریعہ تھا، اس انفرادی اصلاح کے ذریعہ وہ حقیقی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ جس کی ضرورت وہ معاشرہ میں محسوس کر رہے تھے، خصوصاً حضرت کمالؔ کے یہاں تصوف کے مضامین "برائے شعر گفتن خوب" کے مصداق نہیں ہیں بلکہ روحانی و اخلاقی اصلاح و ارتقار کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ آپ ایک اہلِ باطن بزرگ تھے، جن کے یہاں تصنع، بناوٹ اور ریار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اُن کا مقصد معرفت الٰہی کے ذریعہ عرفانِ ذات تھا اور مخلوق خدا کی ہدایت و خدمت کے ذریعہ قربِ الٰہی تک پہنچنا تھا۔ عام زاہدوں اور واعظوں کی زندگی میں جو مکر و ریا اور دنیا پرستی ہوتی ہے حضرت کمالؔ کی شاعری اس سے مبرّا اور پاک ہے بلکہ آپ نے ایسے زاہدوں کی خوب خبر لی ہے، فرماتے ہیں ؎

فریب دیوے ہے زاہد سراب کے مانند یہ زہد خشک کو اپنے دکھاوے ہے دریا

خدا کی راہ میں یہ غول رہ نما دیکھو فریب دیوے ہے ناداں کو زہد سوں زاہد

حضرت کمالؔ کے یہاں داخلیت کے عناصر، حقیقتاً انفرادی اصلاح اور رشد و ہدایت کا وسیلہ تھا اپنی ذات میں گم رہنا، دنیا سے دوری اور رہبانیت جو اس دور کا عام مذاق صوفیانہ بن چکا تھا، حضرت کمالؔ کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا، اُن کی زندگی سے دل چسپی، مسائل حیات کی فکر، حالات پر قابو پانے کی تمنا اور میر کارواں کی تلاش کا جذبہ، اس بات کی غماز ہے کہ وہ حالات سے صرف غیر مطمئن ہی نہیں تھے بلکہ اس کو بدلنے کی آرزو بھی رکھتے تھے بلکہ خانقاہی نظام کے ذریعہ اس انقلاب کی تیاری میں تھے جس کی اسلامیانِ ہند کو ضرورت تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں گردِ راہ ہوا، میر کارواں کی قسم صدا جرس کی نہیں پہنچی آج تک مجھ کو

جہاز غرق ہو گر اس میں نا خدا نہ رہے خطر ہے بحرِ خرد میں اگر جنوں نہ رہے

کھڑا ہے قافلہ حیرت سے مثلِ سنگِ نشاں　　　خدا کرے کہ ابھی میرِ کارواں آئے

اس دور کے کفر و شرک اور الحاد و بے دینی کو دیکھ کر آپ کا دل کتنا پریشان تھا اور اس کو بدلنے کی کیسی تڑپ تھی، ایک پوری غزل اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ زبان و بیان کا انداز ایسا ہے جیسا اٹھارہویں صدی کے بجائے اس بیسویں صدی کا کوئی شاعر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہو ؎

آہ زنّارِ بند دیکھ مجھے　　　بہت حیرت سے برہمن رویا
آہ ایماں سے اس قدر گذرا　　　کفر پر میرے برہمن رویا
سُن کر افسانہ میری رقت کا　　　آہ کر میر انجمن رویا
میری وحشت کوں دیکھ صحرا میں　　　سر پٹک آہوئے ختن رویا
خاک تربت کو دیکھ کر میرے　　　سر پٹک میرِ کارواں رویا
آہ، میری کوں سُن کے گلشن میں　　　گر پڑا سرو، باغباں رویا

رقت دل سوں میری آہِ کمال
بہہ گیا باغ، باغباں رویا

یہ پوری غزل حضرت کمال کے فکر و فن کی آئینہ دار ہے۔ ایک دوسری غزل کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

اُڑتا پھروں ہوں دشت میں جیوں گردِ کارواں　　　منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہ بر کہیں
اب میں چلا ہوں ہاتھ پہ رکھا اپنے سر کے تئیں　　　لیکن نہ ہو قبول میرا سر اگر کہیں
کہنے لگے جو دل سے مرے دوستدار بھی　　　آتا ہے اضطراب کوئی اس قدر کہیں
عاشق کو کب ہوے ہے عزیز اپنا سر کہیں　　　اس کو نہیں ہے خوف کہیں اور خطر کہیں
ملتی نہیں ہے یار کی مجھ کو خبر کہیں　　　جاوے ہے دل کہیں و پریشاں نظر کہیں

گذری ہے سر پہ میری قیامت کی شب کمالؔ
مِل جاوے صبح ہوتے ہی شمشیر و سر کہیں

غزل کے اِن اشعار میں ایک انقلابی تصوّر ہے، جس کے پیچھے، معاشرہ میں جہدِ وعمل کی راہ ہموار کرنا ہے اور زندگی سے فرار کے بجائے راستے کے سنگ گراں سے ٹکرانا اور جہد وعمل کے لئے راہیں نکالنا شاعر کا مقصد عظیم ہے۔

بے ثباتیٔ دُنیا

اہلِ دل صوفیاء کے یہاں دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اُمراء اور بادشاہوں کے دَور میں عیش کوشی اور دُنیا پرستی کا جو مزاج بن گیا تھا، اُس کی اصلاح اور عوام کی اخلاقی درستی اور انسانی جذبۂ خدمت اور رحمت کے لئے بے ثباتی اور قناعت پر زیادہ توجہ دی۔ اہل فکر اور اہل دل شعراء نے اپنی شاعری میں بے ثباتی دُنیا کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مادی دنیا کی ناکامی کو بے حقیقت سمجھنا اور دُنیا کی ناپائیداری کو اصل قرار دینا، صوفیاء کا مشرب و مسلک قرار پایا۔ حضرت کمال کے یہاں عام صوفیانہ روش سے ہٹ کر زندگی سے فرار اور دوری کا تصور نہیں ملتا، بلکہ دُنیا کی بے ثباتی ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو واقعہ ہونے کے باوجود زندگی سے فرار نہیں سکھاتا، بلکہ انسان کے اندر رحم، ہمدردی، اخوت اور انسانی خدمت کے جذبات پیدا کرتا ہے تاکہ ہمارے اندر سے دُنیا طلبی، عیش کوشی کے جذبات دبیں اور سادگی، قناعت اور توکّل کے جذبات اُبھریں اور پروان چڑھیں حضرت کمال کے بے ثباتی دنیا اور قناعت کا یہ تصوّر اُنھیں اُس دَور کے دوسرے معاصر شعراء سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تو نقش آب دار پر ہے تجھے ثبات کہاں　　　کہ ایک دم کے سوا بھی کہیں حباب رہا

جز مشتِ خاک کچھ نہ رہے گا نشانِ عمر　　　ملکِ عدم کو جاتا ہے یہ کاروانِ عمر
غافل نہ ہو کمال ٹک اک چشم کھول دیکھ　　　ہے آخرت کے دشت میں جوئے سرابِ عمر

جسے شعور ہے کچھ بھی وہ اس قدر جانے　　　قضا بھی کچھ ہے اگر بندۂ رضا نہ رہے

غم پرستی غم والم ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انسان مبّرا نہیں۔ غمِ روزگار ہو یا غمِ جاناں ہر انسان اِس کا شکار ہے۔ اکثر شعراء کے یہاں غم انفرادی اور ذاتی مسئلہ کی حیثیت ہوتی ہے۔ میؔر نے ذاتی اور انفرادی غم کو اتنی وسعت دی کہ اس میں آفاقیت پیدا ہوگئی۔ حضرت کمالؔ کے یہاں بھی غم کا تصور ملتا ہے لیکن اُن کا غم نہ غم روزگار تھا اور نہ غمِ جاناں۔ اُن کے غم کو غمِ عقبیٰ کہہ لیجئے۔ آخرت کی حقیقت کا یقین اُن کا مشاہدہ تھا اور انسانیت کی دنیا پرستی کو دیکھ کر وہ کڑھتے اور غم کھاتے۔ اس طرح اُن کا غم آفاقی بھی تھا اور انسانی بھی۔ اُن کی شاعری میں جو غم کے عناصر ملتے ہیں اس میں غمِ عقبیٰ کا احساس اور انسانیت کی بھلائی کا غم نمایاں نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اس زندگی کے قصّہ کے تئیں مختصر کرو — یعنی کہ اشک و آہ سوں ہے آب و نانِ غم

کبھی سُنے جو کوئی سینہ اس کا جل جاوے — اثر رکھے ہے فغاں میری آہ کے مانند
کہاں تلک نہ ہووے جسم زار میرا — میں صرف گریہ ہوں ابرِ سیاہ کے مانند
فغاں کو سُن کے میری آہ کس کو تاب رہے — اگرچہ کا پنوں ہوں تارِ رباب کے مانند

یہ دشتِ غم میں کہاں تک رہے قدم ثابت — کہ آ گری ہے میرے سر پہ آسمانِ فراق

کس کو خبر ہے آہ مرے داغِ عشق کی — خاموش ہو کے جلتا ہے یعنی کباب دل

مرنے کے بعد بھی نہ گیا دل کا اضطرار — تڑپے ہے آج تک میری خاکِ مزار دیکھ

رقّتِ دل ہے اس قدر میری — میرے رونے پہ اب قضا رو دے

اس دل کے نئیں اور سوں کب تاب بیاں ہے　　　احوال خرابی کا مری تم پر عیاں ہے

نشاط آمیزی مسرت، نشاط، حسن و شگفتگی، اُردو شاعری کی اہم خصوصیت رہی ہے، حضرت کمالؔ کے معاصرین میں میر دردؔ، سوداؔ اور دوسرے شعراء نے بھی اُردو شاعری کو نشاط آمیز اور مسرت بخش لب و لہجہ عطا کیا، لیکن حضرت کمالؔ کا رنگ و آہنگ اور اُن کی آواز اپنے ہم عصر شعراء سے بڑی مختلف ہے، اُن کی آواز میں انفرادیت اور مخصوص نیا رنگ و آہنگ ہے۔ بے حیائی، فحاشی، لذتیت اور جنسیت سے کوئی دور کا تعلق نہیں بلکہ ایک رکھ رکھاؤ، اعتدال اور توازن ملتا ہے۔ شوخی و شگفتگی بھی ہے۔ لیکن متانت اور سنجیدگی کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔ رعنائی خیال، نشاط آمیزی اور مسرت آگیں جذبے کے ساتھ پاکیزگی فکر اور بصیرت اُن کے کلام کی ایسی خوبی ہے جو اس فن میں بھی اُنھیں دوسروں سے منفرد اور ممتاز بنا دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سو ٹکڑے جگر اس کا ہو مانند کتاں کے　　　مہتاب جو دیکھے کبھی اس مہر جبیں کو
اُس کا کل مشکیں میں جو ہے بوئے دل آویز　　　یہ بوئے دل آویز کہاں نافۂ چیں کو

کبھی تو آئے گی اس دل میں سرخوشی کی بہار　　　ہمیشہ باغچے سوں موسم خزاں نہ رہے
کبھی جو مہر جبیں بے نقاب ہو جائے　　　ہر ایک ذرّہ وہیں آفتاب ہو جائے

اگر چہ صبح قیامت ہو وہیں شام ہو جائے　　　جو زلف چہرے پہ اس کے کبھی پریشاں ہو جائے

گر نقاب اس رخِ روشن سوں کبھی گر جائے　　　بام گردوں سے خجل ہو مہِ تاباں گر جائے

فروغِ صبحِ تبسّم کا اس کا گر دیکھے　　　تمام ذرّہ ہووے آفتاب کے مانند

جو دل گداز ہو روشن ہو وقت پیری کے   سحر کو شبنم گلزار مہر تاباں ہو

سخن میں اس کی اثر ہو نفس معطر ہو   زباں پہ جس کی کبھی شہ کا پاک نام آوے

خارجی عناصر

حضرت کمال کی شاعری کا ایک مخصوص ادبی تصور ہے، جو اُن کی غزلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کی زندگی کے روحانی و اخلاقی پس منظر اُن کی شاعری میں رعنائی فکر، پاکیزگی خیال کے جلوے نظر آتے ہیں اور وہی اُن کی پاکیزہ شاعری کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے دو سو برس پہلے کے اس صوفی شاعر کے یہاں اُردو شاعری کے داخلی و خارجی عناصر کا بہترین امتزاج ہمیں ملتا ہے۔ یہ حسین امتزاج اس دَور میں صرف اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہی دل کشی و دل آویزی اور زندگی آمیزی جو اقبال کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اس کا عکس حضرت کمال کے یہاں پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس عظیم شاعر کی ذہنی و فکری سطح اپنے دَور سے کتنی بلند تھی۔ بہار کے صوفیائے کرام کی انکساری اور اپنی پردہ پوشی خصوصاً مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے فردوسی مزاج نے حضرت کمال کی شخصیت اور شاعری دونوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اور اس عظیم شاعر کی تمام شاعرانہ عظمت اور حکیمانہ بصیرت قلمی بیاضوں میں دب کر رہ گئی تھی آج جب ہم اُن کے کلام کو پڑھتے ہیں تو اُن کے نغموں کی دل کشی و دل آویزی میں کھو جاتے ہیں حضرت کمالؒ نے ادب یا شاعری کو کبھی ذہنی تلذذ عامیانہ مذاق یا عاشقانہ مزاج کی وجہ سے نہیں اپنایا بلکہ اُن کی شاعری کا مقصد عظیم کائنات کے اسرار سربستہ کی پردہ کشائی اشارات، کنایات میں معاشرہ کی اصلاح اور مخلوق خدا کی ہدایت و رہنمائی تھی، ہر بڑے شاعر کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس کا شعر و ادب اپنے پس منظر میں ایک مخصوص تصور لئے ہوتا ہے جو اس کے تصور ذات، اس کے علمی مرتبہ و مقام اور اس کی عملی زندگی سے ہم آہنگ ہوتا ہے اِس طرح حضرت کمال کی شاعری خصوصاً غزلوں میں وہ تمام داخلی و خارجی عناصر پائے جاتے ہیں جو ایک اعلیٰ درجہ کی

شاعری میں ہونی چاہیئے ان تمام داخلی و خارجی عناصر سے حضرت کمالؒ کی غزل گوئی کے اجزائے ترکیبی تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔

حضرت کمالؒ کی غزل کے اجزائے ترکیبی میں، اُن کے داخلی عناصر جس پر پچھلے صفحات پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں اُن کا جذبہ، اُن کا خلوص اور اُن کا عشق نمایاں ہے جسے وہ ایمان و یقین کی روشنی، فکر صالح کی تابانی اور روحانی اثر آفرینی سے جلا بخشتے ہیں۔ پھر ان سے شعر و ادب کی جو تخلیق ہوتی ہے اس میں شاعری کے وہ تمام خارجی عناصر مثلاً سادگی بیان، سلاست و روانی، تشبیہات و استعارات، شاعرانہ مصوّری، فکر انگیز جوش بیان، سوز و گداز، رمز و ایما، حسنِ ادا، تمثیل نگاری اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے اور یہ حضرت کمالؒ کی شاعری کی ایسی ظاہری خوبیاں ہیں جس سے اُن کی شاعری کے فن میں ہمیشہ تابندگی اور جگمگاہٹ باقی رہے گی۔

حضرت کمالؒ کے اِن شعری محاسن اور فنّی خصوصیات کو یہاں قدرے تفصیل اور مثالوں سے وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔

سادگیٔ بیان حضرت کمالؒ کی غزلوں میں غزل کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو غزل کے اچھے شعر کی جان ہوتی ہے، سادگی و پرکاری کسی اچھے شعر کی خصوصیت ہوتی ہے، میر کی طرح سہل ممتنع اور سادگیٔ بیان کی بہت سی مثالیں ان کے یہاں ملیں گی۔ اس سادگی میں حسن بیان بھی ہے اور تاثیر بھی۔ اس سے حضرت کمالؒ کی زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سہل ممتنع اور چھوٹی بحروں میں شعر کہنا، میر کا فن اور ان کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ دونوں خوبیاں حضرت کمالؒ کے یہاں کمال فن کے ساتھ موجود ہیں ؎

اب کہاں تاب انتظار کی ہے | مجھ پہ ایک لحظہ سو قیامت ہے

ہجر کا کیا عذاب ہوتا ہے | آہ دوزخ کا کچھ عذاب نہیں

گرمی آہ دردناک سنے | گر پڑے عیسیٰ آسماں روئے

خاکِ تربت کو دیکھ کر میرے　　سر پٹک میر کارواں رویا
آہ میری کون سُن کے گلشن میں　　گر پڑا سرو باغباں رویا

سلاست و روانی

حضرت کمالؒ کی اکثر غزلوں میں رعنائی خیال کے ساتھ ساتھ غضب کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ کمالؒ ایک صاحب دل بزرگ ہونے کے باوجود فطری شاعر تھے۔ اُن کے یہاں آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔ اُن کے لئے شاعری نہ ذریعۂ عزّت تھی اور نہ ہی ذہنی تلذذ کا وسیلہ، بلکہ اُن کا اندرونی جذبہ اور خیال، شعر کی تخلیق پر آمادہ کرنا، شعر کا یہ فطری تخلیقی عمل سلاست و روانی کی جان ہے جس کی مثالیں کلام کمالؒ میں بے شمار ملیں گی، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تو ننگ و نام کی بات پوچھے ہے زاہد　　کہیں کسی کا محبت میں ننگ و نام رہا

ایسا خموش رہتا ہوں میں اس کے سامنے　　گویا زباں کبھی نہ تھی اپنے دہن کے بیچ

جہاں کہ داغ محبت ہے خیل غم واں ہے　　جہاں کے آگ نہ ہو قافلہ وہاں نہ رہے

تشبیہات و استعارات

ہر بڑے شاعر کے یہاں نادر تشبیہات اور استعارات‘ اظہار بیان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ حضرت کمالؒ کے یہاں بھی نادر تشبیہیں اور حسین استعارے ملتے ہیں۔ ان تشبیہات و استعارات سے حضرت کمالؒ کے کلام کی حسن و دلکشی دوبالا ہو گئی ہے۔ حضرت کمالؒ کی تشبیہیں سادہ و پرکار ہوتی ہیں سادہ و بے جان الفاظ تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے جاندار بن جاتے ہیں اور اثر آفرینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خطر ہے بحر خرد میں اگر جنوں نہ ہووے　　جہاز غرق ہو گر اس میں ناخدا نہ رہے

عقل کے سمندر میں جنوں کی ضرورت ایسی ہی ہے جیسے سمندر میں کوئی جہاز بغیر ناخدا کے ہو تو اس جہاز کا حشر معلوم ہے۔ اقبال کی زبان میں ؎

بیاں میں حال پریشاں مرا کہاں آئے　　یقیں ہے قطرے میں کب بحرِ بیکراں آئے

یہ سیلِ اشک میں بہتا ہے خستہ دل میرا　　شکستہ کشتی و دریائے بیکراں دیکھو

دریائے بیکراں میں، شکستہ کشتی کا بہنا، شاعر کے سیل اشک میں خستہ دل کے بہنے کی کتنی حسین تصویر ہے۔ ؎

کیا سبب ہے کہ گلشن ہے شعلہ زار مگر　　گیا ہے چھوڑ کے آتش کو کارواں میرا

گلشن کا شعلہ زار ہونا اور عاشقانِ الہٰی کے کارواں کی اس راستے سے گذرنے کی جو تصویر اس شعر میں ہے اُس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس درد و تپش کی ضرورت ہے جو عاشقانِ الہٰی کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس طرح کے بے شمار حسین تشبیہ اور خوبصورت استعارے سے حضرت کمالؒ کی شاعری بھری پڑی ہے۔

تمثیل نگاری فن شاعری میں تشبیہات و استعارات کی طرح تمثیل نگاری بھی ایک ایسی صفت ہے جس سے شعر کے حسن و خوبی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر شعراء کے یہاں یہ صفت عاشقانہ عناصر میں استعمال ہوتی ہے لیکن حضرت کمالؒ کے یہاں اخلاقی و روحانی اور حکیمانہ مضامین میں اس کا استعمال بہت خوب صورتی سے ہوا ہے۔ یوں تو غزل کے منفرق اشعار میں حضرت کمالؒ نے بہترین تمثیل نگاری کا مظاہرہ کیا ہے لیکن آپ کی یہ غزل تو مکمل طور پر اعلیٰ تمثیل نگاری کی شاہکار ہے ؎

سیاہ پلکوں نے ظالم کے کر دیا بے کار　　خدنگ و نیزہ و شمشیر اور تبر چاروں
نجف کے گرد حرم چار سو عیاں دیکھو　　کلیم و طور و تجلّی کو اور شجر چاروں
عقیق لب نے صنم کے کیا ہے زیرِ نگیں　　کنشت و کعبہ و زاہد و برہمن چاروں

خدائے دلبر بالا بلند رہیں گے کمالؔ
یہ سرو طوبیٰ و شمشیر و نسترن چاروں

ادا و زلف و خط و خال راہزن چاروں
نگاہ و غمزہ، مژہ چشم، تیغ زن چاروں

کیا ہے خاتم رنگیں دہن نے زیر نگیں
پری و حور و سلیماں و اہرمن چاروں

سیاہ چشم و خط و زلف رُخ نے محو کیا
بنفشہ نرگس و سنبل و یاسمن چاروں

کمر و فرق بدن پر ہے کس قدر زیبا
کلاہ و طرّہ کمر بند و پیرہن چاروں

اِس کے علاوہ غزل کے متفرق اشعار میں تمثیل نگاری کے اور شاعرانہ مصوری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو حضرت کمالؒ کے فن کارانہ کمال کی آئینہ دار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فروغ صبح تبسّم کا اِس کی گر دیکھے
تمام ذرّہ ہووے آفتاب کے مانند

غافل نہ ہو کمالؔ ٹک اک چشم کھول دیکھ
ہے آخرت کے دشت میں جوئے سراب عمر

"آخرت کے دشت میں"، "جوئے سراب عمر" کی تمثیل حضرت کمالؒ کا کمالِ فن ہے۔ "ٹک اک چشم کھول دیکھ" نے اس شعر کی تاثیر دوچند کر دی ہے۔

سوز و گداز

حضرت کمالؒ بنیادی طور پر صاحب باطن بزرگ اور اہل دل شاعر تھے۔ اس لئے اُن کی پوری شاعری سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعے سے اُن کے دل کے سوز و گداز کا پتہ چلتا ہے۔ جب ہم اُن کی غزلوں کو پڑھتے ہیں تو دلوں میں سوز اور جذبہ میں گداز محسوس کرتے ہیں یہ سوز و گداز حقیقتاً شاعری کی جان ہوتی ہے اور حضرت کمالؒ کی شاعری کا فن اس سوز و گداز سے بھرپور ہے ؎

لختِ جگر ہے، سوختہ آنسو یہاں کہاں
بادِ صبا سے پھوٹے ہے چشمے حباب کے

اگر بلند ہووے آہ سوزناک مری
مثال خیمہ کی اک دم میں آشیاں جل جائے

جو دل گداز ہو، روشن ہو وقت پیری کے
سحر کو شبنم گلزار مہر تاباں ہو

اثر آفرینی حضرت کمالؒ کی غزلوں میں زورِ کلام اور اثر آفرینی کے بھی اعلیٰ ترین نمونے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں فکر و فن باہم آمیز ہو کر جذبہ بن گئے ہیں اور اسی جذبہ اور خلوص نے اُن کی شاعری میں ایک تاثیر اور اثر آفرینی پیدا کر دی ہے۔ یہ خلوص اور جذبہ ہی کا جادو ہے جس نے آج بھی حضرت کمالؒ کی شاعری میں تازگی اور تابندگی بخشی ہے جس کو پڑھ کر اُس سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے، یوں تو کلام کمال کے اکثر اشعار تاثیر و تاثر اور اثر آفرینی سے بھرے پڑے ہیں۔ بطورِ نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بیاں جو کیجئے اسے بے شمار ہو دفتر　　　کمال جور کا ظالم کے کچھ حساب رہا

صدا جرس کی نہیں پہونچی آج تک مجھ کو　　　میں گردِ راہ ہوا، میر کارواں کی قسم

کس کو خبر ہے آہ، میرے داغِ عشق کی　　　خاموش ہو کے جلتا ہے یعنی کباب دل

روتا ہے مثلِ شمع کے زار و نزار دل　　　اس زلف سے زیادہ ہے اب بیقرار دل

دل چور نہ کر سنگِ نصیحت سے اے ناصح　　　خاطر پہ مرے حرفِ سبک بارِ گراں ہے

رمز و ایماء غزل کا بلند ترین معیار اردو شاعری میں غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں ملتا ہے۔ دونوں ہی نے حسن و عشق کی کیفیات کو رمز و ایما کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ اور جب کبھی گہرے جذبے کے پُر اسرار کیفیات کو شعر کے جامہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے گی تو رمز و کنایہ سے کام لیا جائے گا، حضرت کمالؒ کا عشق، جو عشقِ الٰہی کا پرتو تھا اِس جذبۂ عشق کو بیان کرنے کے لئے اُنہوں نے بھی رمز و ایما سے کام لیا۔ اُن کی غزل کی خصوصیت میں رمزیت نمایاں ہے، عشق و محبت کے جذبات کو ایسے رمزیہ کنائے میں پیش کرتے ہیں جس میں ایک جہانِ معانی پنہاں ہوتا ہے۔ حسنِ ادا کا یہ ایک ایسا جادو ہے جس سے انسانی ذہن مسحور

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، حضرت کمالؒ نے اپنی قلبی واردات کو جو ایمائی کیفیت عطا کی ہے وہ ان کی شاعری کی جان اور روح ہے، حضرت کمالؒ کے کلام میں اس کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ ذیل میں ایسے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کسی کے چشموں سے پیری میں کب بہے آنسو کسی نے روتے کہاں شمع صبح دم دیکھا

کمال اس لب جاں بخش کے تبسم کو کبھی جو دیکھے یہ رنجور ناتواں نہ رہے

اس شعر کی رمزیت کا حسن اس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم اسی بات کو غالب کی زبان میں اس طرح پڑھتے ہیں ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بہترین رمز و ایما کا ایک بے مثال شعر اور ملاحظہ کیجئے ؎

میں اس بتِ کافر کا برہمن نہیں تنہا اب دیر نشیں ہو گئے، سب کعبہ نشیں بھی

اِس بات کو میرؔ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

فکر انگیز جوش بیان

حضرت کمالؒ ایک فطری شاعر تھے۔ اُن کے یہاں فکر کی گہرائی بھی ہے اور جذبہ کی فراوانی بھی، اس لئے اُن کے کلام میں قدرتی طور پر جوش بیان کا اظہار ہوتا ہے، ایسا جوش بیان جس میں لفظوں کی تازگی کے ساتھ معانی کی ندرت پائی جاتی ہے۔ کلام کمال میں غزل کی وہ تمام شوخیاں اور گرمیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو آج کی غزل کی دُنیا میں معیاری سمجھی جاتی ہیں۔ حضرت کمالؒ کے فکر انگیز جوش بیان کی مثالیں اُن کے کلام میں جا بجا ملیں گی، غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سرکش نہ ہو، تو ہستیٔ موہوم پر کبھی　　چھپ جائے گا، زیرِ خاک ابھی آسمانِ عمر

اگرچہ صبح قیامت ہو، وہیں شام ہو جائے　　جو زلف چہرے پر اس کے کبھی پریشاں ہو

کہاں رکھے قیامت فراق سے نسبت　　میں کیا کہوں کہ جدائی میں کیسا غم دیکھا

اُڑتا پھروں ہوں دشت میں جو گرد کارواں　　منزل کہیں، راہ کہیں، راہ بر کہیں

چمن میں بوئے دل آویز کیسی آتی ہے　　نہ ہو تو صبح کے تیغ وقت، موسم بہار نہ ہو
جرس کے شور کا مضموں یہی ہے اے سالک　　کہ راہِ عشق میں رہزن ہیں بے شمار نہ ہو

اب کہاں تاب انتظار کی ہے　　مجھ پہ اک لحظہ سو قیامت ہے

باب چہارم :

مثنوی : ایک اہم صنفِ شاعری

اُردو شاعری میں مثنوی ایک اہم صنف شاعری ہے۔ اُردو مثنوی کی تاریخ بہت طویل ہے، دکنی دور سے لے کر جدید دور تک بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی سے لے کر میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" مثنوی کی دُنیا میں ایک معیار بن گئی۔ اُردو اور فارسی شاعری میں مثنوی کی صنف بیانیہ اور توضیحی شاعری کے لئے ممتاز رہی ہے۔ فارسی میں "شاہنامہ" رزمیہ شاعری کا سب سے بہتر معیار رہے اور مولانا روم کی "مثنوی معنوی" اسلامی اور متصوفانہ شاعری کا شاہکار ہے۔ جدید دور میں اقبال کا "ساقی نامہ" اُردو مثنوی کا بہترین نمونہ ہے۔

اُردو مثنوی کے ارتقا کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا گو قصہ گوئی اور داستان حسن و عشق سے ہوئی ہے لیکن موضوع کی وسعت، مربوط خیال اور تسلسل فکر کے لحاظ سے یہ اُردو شاعری کی سب سے اہم صنف ہے۔ اس صنف میں بیانیہ اور مرقع نگاری کی توضیحات، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی تاثیر، رزمیہ شاعری کی خوبیاں اور غزل کی گھلاوٹ سب کچھ اس میں پائی جاتی ہے۔ یہ تسلسل فکر اور مربوط خیال در حقیقت ذہنی یکسوئی اور خیال کے ارتقا کی آئینہ دار ہے۔ اور یہی مثنوی کی اصل خوبی اور اس کا فنی کمال ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں جب اُردو ادب و شعر کا مرکز جنوب سے شمال کو منتقل ہوا تو نظم کے مقابلے میں غزل کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی اس کی اصل وجہ تخیل کا ہیجان،

ذہن کا انتشار، سیاسی مزاج اور معاشی و معاشرتی ابتری تھی جس نے یکسوئی فکر اور تسلسل خیال کی جگہ نظم کے مقابلے میں غزل کے لئے حالات زیادہ سازگار بنائے۔ داخلی واردات و احساسات کے اظہار کے لئے غزل کی دنیا میں بڑی وسعت ہے اور یہی وجہ تھی کہ اسی دور کے شعرا میں غزل کی صنف زیادہ مقبول رہی۔ لیکن ان ناسازگار حالات کے باوجود نظم نگاری کا فن بھی ترقی کرتا رہا۔ شعرا کے لئے حصول زر کا ذریعہ قصیدہ تھا۔ داستان طرازی اور مذہبی جذبات کے اظہار کے لئے مثنوی اور مرثیہ نگاری کے فن میں قابل لحاظ اضافے ہوئے۔ اس طرح خالص داخلی زندگی کی عکاسی کے اظہار کے لئے مثنوی اور مرثیہ نگاری کے فن میں قابل لحاظ اضافے ہوئے اس طرح خالص داخلی زندگی کی عکاسی کے لئے غزل کا پیمانہ بنا اور خالص خارجی زندگی کے بیان کے لئے نظم کے رجحان نے ترقی کی، خصوصاً مدحیہ شاعری، داستان طرازی، اخلاقی و مذہبی تصورات اور فلسفیانہ مضامین کے لئے تو نظم نگاری کا فن بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ ان حالات میں مثنوی کا فن جو بیک وقت داستان طرازی اور اخلاقی و مذہبی تصورات و جذبات کے اظہار کا بہترین وسیلہ تھا۔ اُردو شاعری میں شعرا کا یہ طرزادا اور فن کارانہ انداز ہوا کا تازہ اور خوش گوار جھونکا ثابت ہوا۔ جس کے اثرات اُردو شاعری اور ہماری تہذیبی زندگی دونوں پر نہایت خوشگوار پڑے۔

مثنوی ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں ہیئت کی بڑی اہمیت ہے یوں تو مثنوی کا لغوی مفہوم "دوہرا کرنے" کا ہے اور اس سے مراد وہ صنف شاعری ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن اور ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں۔ ہیئت کی اس اہمیت کے باوجود اُردو شعرا، نے مثنوی کو کسی خاص موضوع سے وابستہ اور محدود نہیں رکھا۔ اس طرح حسن و عشق کی داستان سرائی سے لے کر سیر و سیاحت، مذہبی جذبات، فلسفیانہ خیالات اور دوسرے موضوعات کو بھی مثنوی کے دامن میں سمیٹ لیا اس طرح مثنوی میں اظہار خیال کی رنگارنگی، جذبات کی فراوانی، مذہبی افکار کی پاکیزگی اور فلسفیانہ مضامین کی گہرائی کا نہایت خوبصورت امتزاج ملتا ہے جس میں قوس قزح کا حسن اور رنگینی پائی جاتی ہے اسی وجہ سے اُردو مثنوی میں تجربے کی ندرت، جذبے کی تازگی اور خیالات کی شگفتگی ملتی ہے۔ اس طرح اس صنف نے نظم کے اصل معیار کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھا بلکہ اس کے وقار میں اضافہ بھی کیا ہے۔

اُردو مثنوی کے ارتقاء کا مطالعہ، دراصل اُردو قصّہ گوئی کی مختلف شکلوں اور اسالیب کے ارتقا کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ دکنی دَور سے لے کر دہلی اور لکھنؤ کے دَور تک جتنے قصّے اور داستانیں اُردو میں لکھی گئیں وہ منظوم اور سب مثنوی ہیں۔ اُردو مثنویاں موضوع کے اعتبار سے گویا اُردو قصّہ گوئی کی تاریخ کے ابتدائی ابواب ہیں۔ اسی لئے عام طور پر اُردو صنف شاعری میں جب مثنوی کا ذکر آتا ہے تو ذہن خود بخود داستان طرازی اور حسن وعشق کے قصّوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے، کہ تسلسل خیال اور مربوط بیان کے ساتھ طویل شعری کارناموں میں ان داستان طرازیوں کے علاوہ شروع ہی سے دوسرے موضوعات بھی مثنوی کی شکل میں ملتے ہیں۔ خصوصاً اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں اہلِ دل صوفی شعراء نے جو مثنویاں لکھیں وہ دراصل انہوں نے اپنے مذہبی جذبات اور اخلاقی فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا بہترین وسیلہ مثنوی کو بنایا اور اپنی کوشش میں وہ بہت کامیاب رہے۔

مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت اس کی واقعات نگاری ہے۔ ساتھ ہی اس کے اسلوب اور طرز بیان میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کے استعمال کرنے کی بڑی گنجائش ہے لیکن اس کا حقیقی کمال، خیال کا تسلسل اور باہمی ربط ہے۔

مثنوی کا ایک اور وصف اس کا بیانیہ انداز اور اس کی توضیح وتشریح ہے۔ اس میں زمان ومکان کے علاوہ مواقع اور مناظر کی مرقع نگاری کی بڑی اہمیت ہے جو شاعر کے قوتِ متخیلہ کی علامت ہے اور سب سے آخری چیز مثنوی کا وہ مقصد ہے جس پر اس صنف کی ساری عمارت کھڑی نظر آتی ہے۔ بہت کم مثنویاں ایسی لکھی گئی ہوں گی جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یہ مقصد جہاں معاشرتی اخلاقی اور مذہبی رہی ہیں وہاں خالص فن کاری اور اظہار بیان کا حسن بھی اس کا مقصد رہا ہے۔

اس لحاظ سے مثنوی ایک طرف فن کے نقطۂ نظر سے نہایت بسیط، مرکب اور کسی قدر پیچیدہ فن ہے تو دوسری طرف موضوع کے لحاظ سے اس میں بڑی وسعت ہے۔ مربوط افکار و خیالات کے اظہار کا بہترین وسیلہ یہ صنف رہی ہے جس میں فن کارانہ حسن کے ساتھ ساتھ افکار و واقعات کا بڑا دلکش اظہار بیان ملتا ہے اور یہی مثنوی کا فنی حسن وکمال ہے۔

دَورِ کمالؔ کی متصوفانہ مثنویاں

حضرت کمالؒ کا دَور اِس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اُسی دَور میں اُردو کی متصوفانہ مثنویاں بہت زیادہ لکھی گئیں۔ یوں تو مثنوی کے اولین نمونے زیادہ تر دکن میں ملتے ہیں۔ خصوصًا بیجاپور گول کنڈہ کی مثنویاں اپنے فن کے ساتھ مذہبی اور متصوفانہ مثنویوں کے لئے مشہور ہیں۔ اور اس دَور میں بھی صوفیائے کرام نے اپنے فکر و فن کے اظہار کے لئے مثنوی کو اپنایا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں زیادہ تر نصائح، ملفوظات اور متصوفانہ خیالات کے لئے مثنوی کی صنف ہی کا استعمال ہوتا رہا۔ ان ابتدائی مثنویوں میں ادب و فن پر اتنا زور نہیں دیا گیا، جتنا کہ مقصد اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے اس کو وسیلہ بنایا گیا۔ قدیم ترین زمانہ کی اُردو مثنوی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ حضرت باباشیخ فرید شکر گنجؒ (متوفی ۶۶۴ھ) سے منسوب ہیں۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے (۸۶۰ تا ۹۴۵ھ) کے ملفوظات بھی مختصر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت شیخ بہاءالدین برناویؒ دوسرے بزرگ ہیں۔ جن کی نظمیں تصوف اور معرفت کے موضوع پر ہیں۔ ایک اور بزرگ سید شاہ ہاشم حسینی علوی ہیں۔ جن کا سنہ وفات ۱۰۵۹ھ ہے مثنوی کی صنف میں آپ کا کلام کافی موجود ہے۔ یہ سب سلوک و معرفت پر ہے اور یہ سب اُردو مثنوی کی بالکل ابتدائی دور کے اولین جو متصوفانہ مثنویوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ [1]

عہدِ مغلیہ میں جب اورنگ زیب کے ہاتھوں دکن کی تسخیر کا کام مکمل ہوگیا اور دکن بھی مغلیہ حکومت کا ایک صوبہ بن گیا، تو اُردو شعر و ادب کا مرکز دکن سے دہلی منتقل ہوگیا۔ چنانچہ اس دور میں بھی دکنی شعراء میں بعض ایسے شاعر ملتے ہیں جن کی مثنویاں

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء، مضمون اُردو مثنوی کے اولین نمونے: از عبدالقادر سروری

بڑی ممتاز نظر آتی ہیں۔ اس عہد کی متصوفانہ مثنویوں میں بحری کی "من لگن"، وجدی کی "پنچھی باچھا" بہت مشہور اور مقبول مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ عشرتی، جن کا نام سید محمد خاں تھا، ایک مقدس سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے تقدس کے سبب اورنگ زیب بھی ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ انہوں نے سلوک و معرفت پر متعدد مثنویاں لکھی تھیں جن میں سے "چت لگن" اور "دیپک پتنگ" مشہور ہیں۔ ایک اور مشہور شاعر سید شاہ حسین ذوقی بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے "سب رس" کو "وصال العاشقین" کے نام سے مثنوی کا جامہ پہنایا تھا۔ اس عہد کا آخری شاعر ولی اورنگ آبادی ہے جو اپنے اثر اور شہرت کے لحاظ سے اپنے عہد کا عظیم شاعر تھا۔ ولی نے کوئی طویل مثنوی نہیں لکھی لیکن اُن کی ایک مختصر مثنوی "در تعریف سورت" مشہور ہے۔

اُردو مثنوی کے ان ابتدائی نمونوں کے علاوہ، دور متوسط جو حضرت کمالؒ کا دور خاص ہے، اس دور میں اردو مثنوی نے خاص ترقی کی، خصوصاً میر تقی میر نے مثنوی کو بہت ترقی دی اور کئی مثنویاں لکھیں۔ اسی دور میں ولی کے جانشین سراج اورنگ آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں۔ یہ سب کی سب متصوفانہ خیالات کی حامل ہیں اور عاشقانہ مثنویوں میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے۔ سراج کی طویل مثنوی "بوستانِ خیال" اُردو کی بلند پایہ مثنویوں میں سے ایک ہے اور میر حسن کی "سحر البیان" کے بعد "بوستانِ خیال" ہی کا درجہ ہے۔ ان کے علاوہ متصوفانہ مثنوی کے لکھنے میں اسی دور کے ایک شاعر مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں جو مذہبی اور متصوفانہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔

دہلی میں جب اُردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے تھوڑے عرصے کے اندر اندر اس کا اثر دُور دُور تک پھیل گیا۔ چنانچہ پنجاب سے عظیم آباد تک اچھے اچھے شاعر پیدا ہونے لگے۔ پنجاب میں ایک صاحب باطن بزرگ حضرت غلام قادر شاہ گذرے ہیں جن کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ ان کی مثنوی "رمز العاشقین" کے نام سے مشہور ہے۔

اُردو مثنوی نگاری میں اپنے فن کے لحاظ سے میر حسن کی "سحر البیان"، دیا شنکر نسیم کی

"گلزارنسیم" مثنوی نگاروں کے لئے ایک معیار بن گئی لیکن اس دور میں دہلی اور عظیم آباد کے صوفی شعراء نے جو متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لئے مثنوی کے صنف کو استعمال کیا وہ بھی اپنے فکروفن کے لحاظ سے کسی طرح اس دور کی عام معیاری مثنویوں سے کم نہیں ہے۔

خصوصاً عظیم آباد میں صوفی شعراء کی مثنویاں اپنے فنی معیار اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت ممتاز اور منفرد حیثیت کی حامل رہی ہیں۔ مثنویوں میں عارفانہ میلان نمایاں ہے۔ گو عام عاشقانہ اور منظر نگاری کی نمائندگی بھی ملتی ہے۔

شاہ آیت اللہ جوہری، مذاقی پھلواروی مشہور صوفی شاعر گذرے ہیں۔ حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے داماد تھے۔ آپ کے اردو کلام میں مثنوی، مرثیہ، منقبت، شہر آشوب اور قصیدہ ہے۔ مثنوی میں جوہری تخلص اختیار کیا ہے۔ اور مرثیہ میں مذاقی۔ ان کی مشہور مثنوی "مثنوی گوہر" ہے۔ پروفیسر حسن عسکری صاحب صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج نے رسالہ اردو دہلی اپریل ۱۹۴۰ء میں ایک تفصیلی مضمون "مثنوی گوہر" کے متعلق سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس سے شاہ آیت اللہ جوہری کی مثنوی پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنوی مختلف داستانوں پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے آخر میں صوفیانہ کیف وحال پیدا ہوتا ہے اور محض روایتی رنگ کی جگہ تخلیقی قوت پیدا ہوجاتی ہے ؎

دیکھو کثرت میں وحدت کا تماشا
دو شعلے جوں ہوا اک شعلہ پیدا

شیخ غلام یحییٰ قدس سرہٗ حضور کا شمار عظیم آباد کے مشائخ میں تھا، اچھے شاعر تھے، آپ نے درگاہ شاہ ارزاں کی توصیف میں ایک مثنوی تقریباً ۱۱۹۰ھ میں لکھی تھی

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مزار اس کی یہ گنبد نہیں، ہے قبہ نور — وہاں ہے جلوہ نما کچھ عجب طرح کا ظہور
وہاں جو حوض نظر آتے ہیں، وہ حوض نہیں — یں دیکھا چشم صداقت سے آج اس کے تئیں
اور ایک طرف پری رو ہیں مایہ تسخیر — لئے دلوں کو پھنسانے کو زلف کی زنجیر

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی اپنے دور کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ راسخ کو میر کی

شاگردی پر فخر تھا۔ شروع میں فدوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ راسخ کا کلام "کلیات راسخ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں قطعات، رباعیات، غزلیں، قصیدے سب کچھ ہیں۔ اور اخیر میں پندرہ مختلف مثنویاں ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ " اور اصناف کے مقابلہ میں یہ غزل اور مثنوی میں زیادہ کامیاب ہیں۔" "مثنوی جذب عشق" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق — شمع ایوانِ کبریا ہے عشق
آب گوہر ہے اور آتشِ سنگ — ہر جگہ اس کا ایک نیا ہے رنگ
بزم گیتی اُسی سے ہے پُر نور — ذرّہ تا مہر ہے اسی کا ظہور

عظیم آباد کے ایک اور مشہور شاعر قادر علی فگار عظیم آبادی کا ذکر، ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب " بہار میں اُردو زبان وادب کا ارتقا " میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔ "قادر علی عظیم آبادی کی مثنوی " عشق نامہ " کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے۔ یہ مثنوی مولانا جامی کے "قصہ یوسف وزلیخا" کا آزاد چربہ ہے۔" مثنوی عشق نامہ کا آغاز یوں ہوتا ہے ؎

الٰہی عشق سے اپنی تو کر شاد — مرا دل کر تو اپنا عشق آباد
خطِ باطل مری دل سے مٹا دی — تو اپنی حُسن کا جلوہ دکھا دی
منوّر شمع کر داغ جگر کی — کہ بستی ہوئی روشن اس نگر کی
ہوس مٹ جائے دل سی ماسوا کی — رہی باقی ہوا تیری لقا کی

حضرت کمالؔ کے دور میں، اور اُن سے پہلے بھی دکن، دہلی اور عظیم آباد کے شعرا نے جو اُردو مثنویاں لکھیں اُن کا یہ اجمالی تعارف تھا۔ یہ تمام مثنویاں فلسفہ آمیز تصوف کے مضامین سے بھری ہوئی ہیں۔ اُردو کی یہ متصوفانہ مثنویاں اپنے اندر شاعرانہ محاسن رکھتی ہیں۔ منظر نگاری، جذبات نگاری، سوز ودرد، محاکات، تخیل اور نفیس تشبیہات واستعارات کا استعمال ان سب مثنوی نگاروں نے کیا ہے جس سے یہ مثنویاں پُر تاثیر بن گئی ہیں۔

اُردو کی ان متصوفانہ مثنویوں کے درمیان حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی "مثنوی" ایک

ممتاز، منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ شاعرانہ محاسن، انداز بیان کی خوبیاں اور زبان کی سلاست وشیرینی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ متصوفانہ علامتیں اور فلسفہ آمیز تصوف سے تمام مضامین بھرے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی عاشقانہ رنگ اور شاعرانہ حسن بھی نمایاں ہے۔ آئندہ صفحات میں حضرت کمالؒ کی مثنویوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

حضرت کمالؒ کی مثنوی : ایک مُطالعہ

اُردو مثنویوں کی بھری محفل میں، جن میں میر کی بعض مثنویاں، میر حسن "سحرالبیان"، سید میراثر کی مثنوی "خواب وخیال"، دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم"، مومن کی "قول غمیں" اور مرزا شوق دہلوی کی مثنوی "زہر عشق" یقیناً نمایاں اور اُردو شاعری کے خوشگوار جھونکوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں اور ان سب میں قصے کی سادگی، زبان کی صفائی، جذبے اور احساس کی آمیزش پائی جاتی ہے جو مثنوی کے فن کی اعلیٰ صفات ہیں۔ لیکن اُردو مثنویوں کے ستاروں کے اس جھرمٹ میں حضرت کمال کی "مثنوی" مجھے تنہا نظر آتی ہے۔ جس میں مثنوی کی تمام فنی خصوصیات کے باوجود صوری اور معنوی لحاظ سے ندرت پائی جاتی ہے اور تقریباً دوسو برس کی قدیم مثنوی ہونے کے باوجود، دورِ جدید میں اقبال کی مثنوی "ساقی نامہ" کے انداز اور معیار کی معلوم ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اٹھارہویں صدی میں بیسویں صدی کا ذہن و دماغ لے کر پیدا ہوا ہو، ساتھ ہی دورِ متوسط کے اساتذہ سخن کی طرح، اُن تمام فنی خصوصیات کی حامل ہے جو مثنوی کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ زبان کی صفائی، فکر کی پاکیزگی نازک خیالی، جذبات کی مصوری میں کسی سے کم نہیں بلکہ بہ اعتبار معنویت اور ندرتِ فکر و خیال اپنے معاصرین کی مثنویوں سے کہیں برتر ہے۔

حضرت کمال کے اُردو کلام کے تناظر میں جن پر پچھلے صفحات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ حضرت کمال کی یہ مثنوی کچھ زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اُن کے آخری دور کی تصنیف ہے۔ فن میں پختگی اور فلسفہ آمیز خیال کی تازگی اور متصوفانہ فکر کی پاکیزگی نمایاں نظر آتی ہے۔ جیسا کہ مثنوی کے آخری حصہ میں "تسلیم و رضا" کی سرخی کے تحت اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

سحر پیری کا پہونچا ہوش کر ہوش ۔۔۔ چراغِ زندگی ہے دم میں خاموش

اُردو شاعری کا آغاز دینی مذہب کے اظہار اور اشاعت کے وسیلہ کے طور پر ہوا خصوصاً صوفیائے کرام نے اُردو شعر و ادب سے اپنے مقصد اور تبلیغ و اشاعت کا کام لیا اور اپنی شاعری سے عوام کے دلوں کو چھونے اور اُن کے اندر ایمان و یقین کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی اپنے واردات قلبی اور پاکیزہ جذباتِ دلی کے بیان کے لئے اُردو شاعری کو پیغام رسانی کا وسیلہ بنایا اسی وجہ سے اُردو شاعری میں شروع ہی سے اسلامی اقدار تصوف و احسان دینی شعور اور مذہبی جذبات کی آمیزش نظر آتی ہے۔

چنانچہ دورِ متوسط کے شعراء کا کلام عموماً اور دبستان دہلی میں خواجہ میر درد اور عظیم آباد میں حضرت شاہ کمال علی کمال کا کلام خصوصاً صوفیانہ خیالات اور روحانی افکار سے لبریز ہیں۔

اسی دور میں جہاں دہلی کی ادبی و شعری محفلیں، میر درد اور سودا کی نغمہ سنجیوں سے گرم تھیں، اور عظیم آباد میں شیخ غلام علی راسخ، شاہ آیت اللہ جوہری، شاہ نور الحق تپاں پھلواروی جیسے اور دوسرے باکمال شعراء کی مجلسیں شعر و ادب کی دنیا میں اپنا بہار دکھا رہی تھیں۔ بہار کا یہ گم نام مگر باکمال صوفی شاعر گیا ضلع کے ایک دیہات "حضرت دیورہ" میں عزلت و گم نامی اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھا، جہاں ایک طرف تصوف و احسان کی منزلیں طے کر رہا تھا اور رشد و ہدایت کا چراغ جلائے، خلق اللہ کے دلوں کو منور کر رہا تھا تو دوسری طرف اپنے پاکیزہ جذبات اور متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لئے اُردو شاعری میں گلہائے رنگ رنگ کا اضافہ کر رہا تھا، اپنے پاکیزہ جذبات، عمیق افکار اور فلسفہ آمیز تصوف کے اظہار کے لئے اُردو شاعری کی مشہور صنف "مثنوی" کو اختیار کیا۔ مثنوی میں اظہار بیان کی وسعت کے جو امکانات ہیں اِس کے پیش نظر حضرت کمالؒ نے اپنی مثنوی میں اپنے فکر و فن کا جوہر دکھایا ہے اور صوفیانہ اخلاقی خیالات توحید و معرفت اور عشق حقیقی کے مضامین کو دلکش انداز اور پاکیزہ طرز ادا میں پیش کر کے اُردو مثنوی کے صنف میں ایک نیا اضافہ کیا ہے۔ جس میں زبان کی سادگی و سلاست اور فکر کی معنویت و ندرت دونوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

حضرت کمال کی اس طویل مثنوی کو پڑھ کر حضرت کمال کے انداز بیان کی خوبیاں اور مثنوی کی فنی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو مثنوی مختلف زبانوں میں اپنے ادبی معیاروں اور اسلوب زبان و بیان کے لحاظ سے اپنے اندر کافی تنوع رکھتی ہے۔ میر تقی میر کی

مثنوی "خواب وخیال" ہو یا میر حسن کی "سحرالبیان" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" اور مرزا شوق دہلوی کی "زہرِ عشق" یقیناً یہ سب مثنویاں اُردو مثنوی میں اپنا ایک معیار و مقام رکھتی ہیں اور مثنوی کے فن کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ دَورِ جدید میں حالی نے اس صنف کو جو اہمیت دی وہ اس بات کا اعتراف تھا کہ اُردو شاعری کی تمام اصناف میں یہ صنف سب سے زیادہ اپنے اندر اظہار بیان کی وسعت اور ہمہ گیری رکھتی ہے۔ اس طرح حالی نے مثنوی کے ذریعہ زبان کی ترقی کو ایک صحت مند راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ حالی کے بعد شوق قدوائی اُن شعراء میں سے ہیں جنھوں نے مثنوی پر خاص توجہ کی اور کافی سرمایہ اس صنف میں چھوڑ گئے۔ ان کی مثنویوں کے موضوع حالی کی طرح کے مرقعوں سے لے کر، علمی اور فلسفیانہ مسائل پر حاوی ہیں۔ عصرِ حاضر میں علامہ اقبال کی مثنویاں ایک خاص خصوصیت رکھتی ہیں۔ اور اقبال نے اُردو شاعری کی دوسری مختلف صنفوں کی طرح مثنوی میں بھی ایک تازہ روح پھونک دی ان کی مشہور نظم "ساقی نامہ" میرے نزدیک اُردو مثنوی کا جدید ترین اور اعلیٰ معیار ہے۔

حضرت کمال کی مثنوی اپنے انداز بیان اور شعری خصوصیات کے لحاظ سے بڑی حد تک اقبال کے "ساقی نامہ" سے مماثلت رکھتی ہے۔ حالانکہ اقبال جدید دَور کے بلند پایہ اور سب سے پڑھے لکھے شاعر ہیں۔ خیالات کی بلندی، فلسفہ آمیز تصورات کے اظہار اور زبان و بیان کی تازگی و شگفتگی کے لحاظ سے اُردو شاعری میں "ساقی نامہ" مثنوی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے حضرت کمال کی مثنوی کا اگر اقبال کے "ساقی نامہ" سے موازنہ کیا جائے تو زمان و مکان کے دو سو برس کے فرق کے باوجود زبان کی روانی، سادگی اور برجستگی کے ساتھ فلسفیانہ خیالات آمیزش کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کے نمونے ہمیں دورِ جدید کی شاعری میں اقبال کے "ساقی نامہ" سے حد درجہ مماثلت رکھتے ہیں۔

"ساقی نامہ" کی ابتدا اقبال نے موسمِ بہار کے ذکر سے کیا ہے اور "کاروانِ بہار" کے خیمہ زن ہونے کا نقشہ بڑے دلکش انداز میں کھینچا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — اِرم بن گیا دامنِ کوہسار
گل نرگس و سوسن و نسترن — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

"ساقی نامہ" کے اس پورے بند کو پڑھئے اور حضرت کمالؒ کی مثنوی کے اس حصہ پر نظر ڈالئے جو انہوں نے "فصل گل عندلیب" کی سرخی کے تحت لکھے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عجب کیا جو ساقی کرے سیر باغ — نگہ سو کرے گل کو مے کا ایاغ
چمن میں اب کی نیرنگی عجب ہے — صبا سے پوچھ بلبل کیا سبب ہے
عجب کیا ہے جو بلبل کے فغاں سے — گرہ کھل جائے سوسن کی زباں سے
عجب رنگیں بہار ہے یاسمیں میں — گلِ خورشید پھولا ہے چمن میں
نہ لبریز ہے اگر مستی سے گلشن — جھکی جاوے ہے کیوں نرگس کی گردن
طراوت سے کہاں پرواز ممکن — کبوتر یا کہ باز ہو سب ہے ساکن
صبا ساقی سے جا میری دعا کہہ — خمار اس کا رقیبوں سے چھپا کہہ
تپِ غم میں زباں کو لال کی ہے — لبوں پہ مہرِ بُت خانہ نے دی ہے

اب اقبال کے "ساقی نامہ" کے دوسرے مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے ؎

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — میرا عشق میری نظر بخش دے

اب چند اشعار حضرت کمالؒ کے بھی ملاحظہ کیجئے۔ اُنہوں نے "حمد" کی سرخی کے تحت لکھے ہیں ؎

الٰہی غم سے دل بیتاب کر دے | گدازِ عشق سے سیماب کر دے
الٰہی اس کے نامہ کو اثر بخش | یہ خاکِ سوختہ کو اک شرر بخش
الٰہی رحم کر اس خستہ دل پر | بہا سیلِ کرم اس مشتِ گِل پر
الٰہی اشک کو میری اثر بخش | یہ طفلِ خستہ کو یعنی جگر بخش
الٰہی ہجر سے ہوں سخت رنجور | جگر پُر خوں ہے دل ناسور ناسور
الٰہی معرفت اپنی عطا کر | الٰہی یہ میری حاجت روا کر
الٰہی غرق ہوتا ہوں میں دم میں | بہا جاتا ہوں سیلابِ الم میں
تلاطم میں پڑی ہے کشتیٔ دل | مگر موجِ کرم پہنچا دے ساحل
مجھے تو رنگ میں اپنے ڈوبا دے | کلام اپنے سے کچھ مجھ کو سُنا دے

زبان کی خوبی و دل کشی اور انداز بیان کا بانکپن اور جوش و خروش جو اقبال کی شعری خصوصیات اور خوبیاں ہیں وہ سب حضرت کمالؒ کی اس مثنوی میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت کمالؒ اٹھارہویں صدی میں بیسویں صدی کا دل و دماغ اور ذہن و فکر لے کر آئے تھے۔ زبان کی صفائی، ستھرائی اور سادگی و پرکاری میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں۔

حضرت کمالؒ کی مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید دور کی مثنوی معلوم ہوتی ہے اور اقبالؒ کی مثنوی "ساقی نامہ" کے انداز بیان اور اس کی تمام شعری خصوصیات کی حامل ہے۔

حضرت کمالؒ کی اس مثنوی کا تفصیلی جائزہ اور خصوصاً اس کی متصوفانہ علامتوں کی نشان دہی آئندہ صفحات میں کی جائے گی تو اس سے حضرت کمالؒ کی مثنوی کی شعری خصوصیات، انداز بیان کی خوبیاں اور متصوفانہ علامتوں کے اظہار میں اُن کے فن کا رنگ و آہنگ اور اُن کے فکر کی روشنی و تابانی نظر آئے گی۔

یہ طویل قلمی مثنوی، جو تقریباً پانچ سو اُنہتر (۵۶۹) اشعار پر مشتمل ہے۔ حضرت

شاہ کمال علی کمالؒ کی خانقاہ، خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کے کتب خانہ میں محفوظ و موجود ہے۔ اسی مثنوی کے ایک نسخہ کا ذکر مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی مرحوم نے اپنے مضمون "شاہ کمال علی اور اُن کی مثنوی اُردو" جو ماہنامہ ندیم گیا کے ماہ فروری ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ :۔

"مثنوی مذکور ہمارے مخدوم زادہ مولوی سید عبدالحمید قادری بی اے خلف اکبر جناب مولوی سید عبدالرشید صاحب رئیس کارا ضلع گیا کی قلمی کتابوں کے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔"

میرے پیش نظر جو نسخہ ہے، وہ اصل نسخہ ہے اور اسی کی وہ قدیم نقل ہے، جس کا ذکر مولانا عبدالرؤف نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ خانقاہ دیورہ کے اس قلمی نسخہ کی پوری نقل، مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر پٹنہ[۱] میں شائع کی ہے جو انہیں عم مکرم حضرت شاہ محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب سجادہ خانقاہ برہانیہ کمالیہ کے توسط سے حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح یہ مثنوی جو اس وقت میرے پیش نظر ہے حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی وہ قابل اعتماد اردو مثنوی ہے جو خانقاہ کے کتب خانہ میں ہنوز محفوظ ہے۔

یہ مثنوی، جو ایک قلمی نسخہ ہے، یہ کاغذ اور شان کتابت سے کہنہ معلوم ہوتا ہے جس پر سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ چونکہ یہ حضرت کے دور اخیر کی مثنوی ہے اور حضرت کمالؒ کا سال وصال ۱۲۱۵ھ ہے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ غالباً یہ مثنوی ۱۲۱۲ھ یا ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی ہوگی ۔ واللہ اعلم

مثنوی کا آغاز، تمہید کے پانچ اشعار سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد مختلف عنوانات قائم کئے ہیں۔ ہر عنوان میں لفظ "سرخی" کے تحت فلسفیانہ مضامین اور مسائل تصوف کو نہایت دل کش انداز بیان اور سلیس زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ زبان بیان کی

---

[۱] ماہنامہ معاصر پٹنہ، شمارہ

جو قدرت آپ کو حاصل تھی اس کی بنا پر اپنے مقاصد کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

اثبات واجب مثنوی کے آغاز کے پانچ اشعار کے بعد اصل مثنوی " اثبات واجب " کی سرخی کے تحت شروع ہوتی ہے، خدا کے وجود کا اثبات، جس طرح کمالؔ نے اپنی مثنوی کے آغاز میں کیا ہے وہ ان کے علم و فضل اور فلسفہ و حکمت پر ماہرانہ قدرت کی دلیل ہے اور فلسفہ کے اتنے عمیق مسائل کو شعر کے جامہ میں پیش کرنا ان کا کمال ہے۔ عدم، وجود اور علت و معلول کی فلسفیانہ بحثوں کو بڑی خوبی سے آپ نے پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ سرخی ہے اثبات واجب کا باغ گل اور عندلیبوں کا دل داغ داغ
غرض اس کا اثبات ممکن کہاں دلیل اپنی خود آپ ہے بے گماں
سمجھ جاؤ مفہوم واجب سے تم حکیموں کا یاں ہوش ہوتا ہے گم
سمجھ جا گا جو اہلِ انصاف ہے کرے وجد اس پر جو دل صاف ہے
نقیروں کا جب سے ہوا خاک پا مرے دل سے حجت کا زنبہ اٹھا
دلیل اس کی پھر واجب کا مفہوم کہ واجب ممتنع ہو کر ہو معدوم

اس کے بعد مسلسل تقریباً بیس اشعار میں اثبات واجب تعالیٰ پر دلیلیں دی ہیں۔ آخر میں اس بحث کا خاتمہ ان دو شعروں پر کیا ہے ؎

جو سابق ہو عدم بے شک قدیم ہے تو پس حادث کہاں رب کریم ہے
عدم لاحق اگر ہو دور عیاں ہے جو ممکن ہو غنی ممکن کہاں ہے

حمد اثبات واجب کے بعد، حمد کی سُرخی کے تحت بتیس[۳۲] اشعار میں، حمد باری تعالےٰ پیش کیا ہے۔ ہر شعر کیف و جذبہ سے بھرپور ہے۔ طبیعت میں جوش اور روانی ہے اس کا اثر ہر شعر سے نمایاں ہے۔ نمونتاً چند شعر درج ذیل ہیں ؎

الٰہی حمد تیری کب بیاں ہو اگرچہ مو بہ مو تن پر زباں ہو
الٰہی شعلہ کر خاک سیہ کو گرا اس کاہ پر برقِ نگہہ کو

الٰہی قفلِ دل ہے زنگ بستہ — کلید قفل سے کر دے شکستہ
الٰہی دل کو نازک اس قدر کر — کہ موجِ بوئے گل ہو تیز اس پر
الٰہی غم سے دل بے تاب کر دے — گدازِ عشق سے سیماب کر دے
الٰہی اس کے نالہ کو اثر بخش — یہ خاک سوختہ کو اک شرر بخش
الٰہی رحم کر اس خستہ دل پر — بہا سیلِ کرم اس مشتِ گِل پر
الٰہی معرفت اپنی عطا کر — الٰہی یہ میری حاجت روا کر

اِن اشعار کی توضیح و تشریح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اسی روانی اور جوشِ بیان کے ساتھ مسلسل ۳۲ شعر کہے ہیں۔ ہر شعر میں فکر کا نور روشن ہے۔ حمد کے اس عنوان کے تحت آخر کے دو شعر اور ملاحظہ کریجئے اور اسی کے بعد توحید کی سُرخی شروع ہوتی ہے ؎

کمال اے شبنم گلزار خورشید — پیا صبحِ ازل سے جام توحید
دوئی کے دشت سے سیل ہو گذر کر — لبِ دریائے وحدت پر گذر کر

توحید صوفیائے کرام کے یہاں توحید کا موضوع بڑا اہم رہا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی حقیقت اور روح توحید پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے،

حضرت شاہ کمال علیؒ اپنے وقت کے باکمال صوفی بزرگ تھے اور علوم ظاہر و باطن میں آپ یگانہ روزگار تھے۔ اسی لئے اپنی مثنوی میں توحید کی سُرخی کے تحت تقریباً ایک سو نو (۱۰۹) اشعار کہے گئے ہیں جس میں توحید کا بیان ہے۔ متصوفانہ انداز اور متکلمانہ شان سے توحید کی تعریف و تقسیم اور اس کے دلائل کو بیان کیا ہے جس میں ذات باری، وجود باری اس کا قدیم ہونا، وحدت الوجود، توحید اور اقسام توحید، توحید ایمانی اور توحید علمی کو متکلمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ توحید کے وسیع موضوع پر ہر پہلو سے آپ نے روشنی ڈالی ہے۔ اس موضوع پر مندرجہ ذیل اشعار سے آپ کے فکر و فن کا اندازہ ہو گا ؎

یہ سرخی ہے توحید کی بوجھ لو — مگر پہلے خون اپنے ہاتھ سے دھو

سمجھ اس کو کہتے ہیں توحید کے — کہ عاقل ہووے داد تجرید کے
کہاں ذہن پہنچے گا توحید تک — یہ کثرت لے آوے گی ہر لحظہ شک
ولایت کا گر نور پہنچے وہاں — قوی ہووے اس نور سے نور جاں
نظر آوے تب نور باطن تمام — ہوئی صبح توحید کثرت کی شام
اگر چمکے واں نور توحید کا — تو ذرّہ ہووے داغ خورشید کا
ہو منکر اس نور کے اے عزیز — اسی نور سے نور کو ہے تمیز
غرض لغزش پا کا ہے یہ مقام — اسے کفر کہتے ہیں علمائے عام

کمال اے بے خبر صبحِ ازل سے — سراسر بے خبر علم اور عمل سے
تو اس کے نام کو کر تاج توحید — کہ جس کی باغ کا شبنم ہے خورشید
صدف میں بحر کے روشن گہر ہے — جو دل میں سنگ خارا کے شرر ہے
جسے دیکھو وہی برہانِ حق ہے — جو کچھ موجود ہے وہ شانِ حق ہے

سمجھو توحید کیا علم دقیق ہے — نہ پہنچے اس کو گو فکر عمیق ہے
کوئی کہتا ہے کل ہے گی وہ ذات — اسے تمثیل سے کرتے ہیں اثبات

مگر موجود و ممکن دو کہاں ہے — اسی واحد کا جلوہ ہے جہاں ہے
تکثر وہی رہے اور اعتباری — کہاں ہو ذات واجب تک وہ ساری
اگر توحید اعیانی نہ بوجھو — تو یہ توحید علمی خوب سمجھو
وہ حق جانو خدا نے جو کہا ہے — وگرنہ ثمّ وجہ اللہ کیا ہے

محبت توحید کے تفصیلی ذکر کے بعد "لواحق توحید" کی سرخی بنائی ہے اور اس سلسلہ میں توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے بعد محبت الٰہی کی حقیقت پر روشنی

ڈالی ہے اور محبّت کی توصیف و تعریف اپنے انداز خاص میں کی ہے۔ صوفیا کے یہاں محبّت کا موضوع بڑا اہم رہا ہے، اُن کا قلب جو جلوہ گاہ الٰہی ہوتا ہے، اُن کی محبّت کی شعاعیں ساری انسانیت پر پڑتی ہیں۔ اس طرح اُن کا دل انسانی، آفاقی محبّت کا آماج گاہ ہوتا ہے۔ چنانچہ محبّت کے موضوع پر فرماتے ہیں ؎

محبّت سر بسر اعجاز سمجھو — محبّت کو خدا کا راز سمجھو
محبّت سے فلک رقصاں ہے دائم — محبّت سے زمیں دریا یہ قائم
محبّت مظہرِ سرِّ خدا ہے — ھمائے اَوجِ عرشِ کبریا ہے
محبّت مور کو کر دے سلیماں — گدا اور شاہ کو کر دیوے یکساں
محبّت صاف و روشن سینہ کر دے — حرارت سنگ کو آئینہ کر دے
محبّت گر نہیں افسردگی ہے — کہاں ہے زندگی، دل مردگی ہے

اثبات رویت الٰہی

رویت الٰہی اور مشاہدۂ حق کا تصوّر صوفیائے کرام کے یہاں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اُن کا یقین ظن و تخمین اور دلیل و حجت کا مرہونِ منّت نہیں ہوتا وہ "عارف ہرچہ گوید دیدہ گوید" کا مصداق ہوتا ہے۔ حضرت کمالؔ نے رویت الٰہی اور مشاہدۂ حق کے تصور کو اپنی مثنوی میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ علمی دلائل و براہین کے ساتھ روحانی مشاہدہ کی کیفیات کو بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے ؎

یہ سُرخی ہے اثبات رویت سمجھ — جگر خوں نہ کر اہلِ حکمت سمجھ
بدن سے ضعیف ہو گیا نور جاں — نہ دیکھے گا نور قوی بے گماں
وگرنہ خدا کو کہاں ہے نقاب — مگر شدّت نور واں ہے حجاب
قیاس اپنے اوپر، کریں ہیں سبھی — نبی اور ولی کوں مگر میں کبھی
اگر رویت محال ہوا ہے نکو خو — طلب اوس کی ہو ممکن کب بنی سو
سنو تم اک دقیقہ اے کہ وہ — کہ عارف من ترا فیہ ہے بغیہ

اگر رویت محال ہوتی سراسر — نہ کہتا لن ترانی اے برادر
کہاں عاجز ہے دکھلائے اپنے — دکھاتا ہے عیاں عاشق کو اپنے
نہ ہو گر روح انساں کی منور — تو کب ظاہر ہووے کچھ اس کے اوپر

اگر رویت محال ہوتی اے دانا — تو کب بر آتی عاشق کی تمنّا
ابد تک آتشِ حسرت میں جلتا — مثال شمع موم ہر لحظہ گلتا
بعید ہے رحمتِ رحماں سے سمجھو — خصوصاً رحم بے پایاں سے سمجھو
جو عاشق ہے وہ ہے دیوانہ اس پر — جہاں وہ شمع پر پروانہ اس پر
اگر کہنا مرا باور نہیں ہو — کہو جا کر کسی عارف سے رو رو
کہ شاید گریہ او پر رحم آئے — کبھی نور ولایت کو دکھائے
اگرچہ عقل بحرِ بیکراں ہے — اُسے اس نور سے نسبت کہاں ہے

مشاہدۂ حق کی یہ گفتگو، ایک ایسے عارف باللہ کی ہے جو صرف علم و عقل اور دلیل و حجّت سے رویت الٰہی کا اثبات نہیں کر رہا ہے بلکہ عارفانہ مشاہدہ کا یقین ہے۔ جو نور روحانی سے منوّر ہے اور جو زبان حال سے اپنے عشقِ حقیقی کے تجربے اور مشاہدے کو بیان کر رہا ہے۔

عشق حضرت کمالؒ کا تصوّرِ عشق، عشق حقیقی کا مظہر ہے۔ اُن کا جذبہ و تخیل عشق سے ہمیشہ تابناک رہا، عشق ہی اُن کے خارجی احوال اور اندرونی روحانی تجربوں میں وحدت پیدا کرتا رہا ان کے یہاں حقیقت ہے، مجاز کا کوئی تصور نہیں ملتا حضرت کمالؒ اپنا دل محبوب حقیقی کو حوالہ کر کے اِس کے قرب کے آرزومند رہے۔ اس طرح کائنات کے ذرّے ذرّے میں اُنھیں عشق ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اُن کے عشق کی منزل اور مقصود و منتہیٰ جلوہ الٰہی تک رسائی تھی۔ اس طرح اُن کے عشق کی بدولت

جذبات میں عمل کی پاکیزگی اور روحانی بلندی ملتی ہے۔ اُن کے عشق میں عام صوفیاء کی طرح خدا کو مرکزیت حاصل ہے' وہ اسلامی توحید کے قائل ہیں۔ اُن کا آئینہ دل جمال الٰہی کا پرتو ہے۔ اس طرح حضرت کمالؔ کا عشق اُن کے روحانی تجربوں کی داستان اور عشق حقیقی کا ترجمان ہے۔

ابتدا کے چند اشعار میں عشق کی تعریف ہے' اور پھر عشق کے اثرات و برکات کو والہانہ اور عارفانہ انداز میں بیان کیا ہے ؎

یہ ہے سُرخیِ عشق دریائے خوں — سفینہ کا یاں ناخدا ہے جنوں
کمالؔ اے عشق کے خنجر سے بسمل — تڑپ وجد کے ہر دم ترا دل
یہی عشق ہے زمیں سے آسماں تک — یہی عشق ہے مکیں سے لامکاں تک
جو کچھ تھا گنجِ مخفی عشق تھا عشق — تمامی سرِ معنی عشق تھا عشق
نہ مہر و ماہ نہ عرش بریں تھا — نہ بحر و بر نہ فرش بریں تھا
نہ تھا جب کچھ بھی ممکن عشق تھا عشق — اگر تھا بحر ساکن عشق تھا عشق
ازل سے ابد تک عشق ہے عشق — نہایت سب کا بیشک عشق ہے عشق
کہاں یہ عالم عشق اور کہاں عقل — اگر چہ ہووے بحر بیکراں عقل
نہ کہہ عاشق پہ اے زاہد تبرّا — کہ عاشق خیر و شر سے ہے مبرّا
اگر ہے عشق تو گمراہی کہاں ہے — طلب کی رہ میں میر کارواں ہے
اگر ہے عشق غم عصیاں کا کیا ہے — کہ بجلی تیرہ شب میں رہنما ہے
سراسر عشق ہے اے دل غنیمت — اگر چہ وہ مجاز ہو یا حقیقت
یہ روشن سب پہ ہے جیوں صبح صادق — کہ عشق پاک سے معشوق ہو عاشق
اگر ماہی ہے سینہ خار خار ہے — اگر مہتاب ہے دل داغدار ہے

نعت اُردو شاعری میں نعتیہ کلام ہر دور اور ہر زمانہ میں شعراء کا موضوع سخن رہا ہے۔ عربی شاعری میں حضرت حسان بن ثابتؓ اور دوسرے شعراء نے نعتیہ کلام میں

اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ فارسی شاعری بھی نعتیہ کلام سے بھری پڑی ہے۔ اُردو شاعری میں تو نعتیہ کلام شروع ہی سے ایک اہم موضوع رہا ہے۔ حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں اظہارِ عقیدت آپ کی توصیف و تعریف ہر مسلمان کا جزو ایمان اور ہر شاعر کے لئے توشۂ آخرت ہے۔

حضرت کمالؔ کی یہ طویل مثنوی بھلا "نعتِ شاہ رسل" سے کیسے خالی رہ سکتی تھی۔ اِس عنوان کے تحت اٹھارہ اشعار میں نعت سید المرسلین ہے جس میں نبوت کاملہ کے خصائص، ختم نبوت، معراج اور دیگر معجزات کو بڑے دل کش اور اچھے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ ہے سرخیٔ نعت شاہ رسل — کہ بے ریب ہیں خواجہ جز و کل
محال ہے ثنا اُن کی یہ ہے ثنا — ثنا بھی کسی نے اگر کچھ کہا
اشارت سے اُن کے قمر دو ہوا — رسولوں میں اس مرتبہ پہ کو ہوا
خیال غنچہ و گل سینہ سے دھو — نبی کے نعت میں داستان سرا ہوا
دہن کو آب کوثر سے صفا کر — خیال موج شاہِ انبیاء کر
اگرچہ نوح شیخ المرسلین تھے — محمد رحمۃ للعالمیں تھے
عجب رحمت کہ بحر بے کنار ہے — سمجھ وسعت میں ذاتِ کردگار ہے

مدحِ شیرِ خدا

صوفیائے کرام کے یہاں مدحِ شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نمایاں رہا ہے۔ تصوف کے زیادہ تر روحانی سلاسل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وسیلہ سے فیوض و برکات کا سبب بنے ہیں۔ حضرت کمالؒ نے بھی اس مثنوی میں مناقب علی شیرِ خدا پر ۳۶ اشعار کہے ہیں۔ جس میں آپ کے حیات مبارکہ کے مختلف پہلو کے فضائل و کمالات بڑے دل نشیں انداز میں بیان فرمائے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ ہے سرخی مدح شیرِ خدا — دو بندے ہیں واں کے قدر اور قضا
دہن بیچ کس کی ہے ایسی زباں — کمالات واں کے کرے کچھ بیاں

خبر لے دم میں اے جاں مردہ ہوں میں
دماغ آشفتہ دل افسردہ ہوں میں

علیؓ کے مدح کا فانوس بجا دے
تو بزمِ دل کو رونق اور صفا دے

زباں کو کس سخن ور کی یہ یارا کی
کرے جو مدح شاہ اولیا کی

زبان و عقل کل قاصر بیاں سے
ادا ہو نعت اُن کی کس زباں سے

جھلک صمصام کی دیکھے اگر برق
وہیں دیکھے تن اپنا خون میں غرق

ولایت ختم ہے شاہِ نجف پر
ولیکن اس کے معنی ہیں برادر

علیؓ کا فیض جاری تا ابد ہے
یہ وہ دریا نہیں ہے جس کی حد ہے

توکّل حضرات صوفیاء کی پوری زندگی توکل علی اللہ کی عملی تصویر ہوتی ہے۔ اُن کا فقر، فقر اختیاری ہوتا ہے۔ دُنیا اُن کے پیچھے دوڑتی ہے اور وہ دُنیا سے گریزاں ہوتے ہیں۔ اِن اہل اللہ کے توکل اور فقر و درویشی کے سامنے شہنشہی بھی، ہیچ ہے۔ اُن کے بوریے کے سامنے سلاطین وقت کے تخت لرز جاتے ہیں۔ حضرت کمالؒ کے نزدیک توکل افسر شاہنشہی اور کلید باب درویشی ہے۔

توکّل کی سرخی کے تحت حضرت کمالؒ نے اپنی مثنوی میں تیرہ اشعار کہے ہیں۔ جس میں توکّل کی تعریف اور اس کی فضیلت و برکت کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

توکّل برق خرمن ہے ہوس کو
جلا دے دم میں اک عالم کے خس کو

توکل افسر شاہنشہی ہے
کلید باب درویشی بھی ہے

توکل صبح خورشید یقیں ہے
فروغ رنگ باغستان دیں ہے

توکل سے گرہ پہنچے صدف کو
کرے لعل یمن سنگ اور خذف کو

توکل زاد راہ ہے رہرواں کا
توکل بدرقہ ہے کارواں کا

توکل بے نیازی کی ہے شمشیر
گدا کو وہ کرے شاہ جہاں گیر

توکل شمع بزمِ اولیا ہے
فروغِ جلوۂ مہر و وفا ہے

تسلیم و رضا اہل اللہ صوفیاء کا مقصود ہمیشہ سے رضائے الٰہی اور خوشنودی رب رہا ہے۔ اپنی آرزو، تمنّا اور خواہش کو فنا کرکے اپنی ذات کو مرضیات الٰہی کے تابع کردینا اُن کا مقصود و منتہیٰ ہوتا ہے۔ تسلیم و رضا کی یہ وہ منزل ہے۔ جہاں پہنچنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ حضرت کمال ؒ ایک اہل دل اور باکمال صوفی بزرگ تھے۔ سلوک کے احوال و مقامات، دوسروں کے لئے اقوال ہوں اُن کے لئے احوال تھے۔ اُن کی شاعری میں اُن تمام احوال کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اِس مثنوی میں تسلیم و رضا کی سُرخی کے تحت تسلیم و رضا کی تعریف و فضیلت کا ذکر کیا ہے ؎

یہ سرخی رضا اور تسلیم کے — گلِ گلشنِ جاں ہے تو گر کہے
رضا نفی ارادت ہے اسے جان — گذر خواہش سے یہ کہا مرا مان
ارادہ عبد اور حق کا جو ایک ہو — تو بندہ فنا در مطلق ہو سمجھو
نہ پہنچے بے رضا ہرگز جناں کو — کہ رضواں اسم مشتق ہے رضا سو

سمجھ تسلیم نفی فعل ہے یار — اسی باعث نہ ہو عارف کا کچھ کار
کہاں عارف کا فعل ہے اختیاری — جو واقع اُن سے ہووے اضطراری
غرض عارف کا سر تسلیم تیغ ہے — کہاں جاں اپنے سے اُن کو دریغ ہے
رہ تسلیم ہے شمشیر اے دل — کریں یاں وجد سب پرواز بسمل

سحر پیری کا پہنچا ہوش کر ہوش — چراغ زندگی ہے دم میں خاموش
اگر عاقل ہے تو دیوانگی کر — اگر تو شمع ہے پروانگی کر

فصل گل عندلیب (بہار) اُردو شاعری میں موسم بہار کی منظر کشی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بقول اقبال ؏

آتی نہیں فصل گل روز روز

اُردو کے اکثر شعراء نے فصلِ گُل کی آمد آمد اور موسم بہار کے جوش و خروش کے دل کشی و دل آویزی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس موسم کی لالہ کاری و گل ریزی اپنے اندر جو حسن اور خوب صورتی رکھتی ہے اس کا اثر انسانی زندگی پر بڑا گہرا اور فرحت بخش پڑتا ہے۔

حضرت کمالؒ کو قدرت نے شعر و ادب کا جو فطری اور حقیقی ذوق بخشا تھا اور آپ کی طبیعت میں حسن فطرت سے جو لگاؤ تھا، اس کا اندازہ مثنوی کے اُس عنوان سے ہوتا ہے جو آپ نے "فصل گل عندلیب" کی سرخی کے تحت لکھا ہے۔ فصل گل کی آمد اور اُس کے حسن و دل کشی کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے وہ آپ کے شاعرانہ حسن اور شعری کمال کا آئینہ ہے۔

فصل گل کی آمد سے چمنِ جہاں میں بہار آتی ہے۔ گل و لالہ کھلتے ہیں۔ کہیں سوسن و یاسمین کی رنگینی ہے تو کہیں سنبل و ریحاں کی چمن آرائی ہے۔ کہیں بلبل کے نغمے ہیں تو کہیں عشاق کے نالے ہیں۔ کہیں مینا کی صدا ہے تو کہیں بادہ گساروں کے قہقہے ہیں۔ موسم بہار کی یہ تصویر شاعر رنگیں نوا کی زبانی دیکھئے ؎

یہ ہے سُرخی فصل گل عندلیب
نسیم چمن کی بھی رنگیں ہے جیب

عجب کیا جو ساقی کرے سیر باغ
نگہ سے کرے گل کو مئے کا ایاغ

چمن میں اب کی نیرنگی عجب ہے
صبا سے پوچھ بلبل کیا سبب ہے

عجب کیا ہے جو بلبل کے فغاں سے
گرہ کھل جائے سوسن کی زباں سے

خزاں کی شام، کیا صبح بہار ہے
کہ موج گل سے رنگیں خار خار ہے

عجب رنگیں بہار ہے یاسمیں میں
گلِ خورشید پھولا ہے چمن میں

نہ لبریز ہے اگر مستی سے گلشن
جُھکی جاوے ہے کیوں نرگس کی گردن

طراوت سے کہاں پرواز ممکن
کبوتر یا کہ باز ہو سب ہیں ساکن

صبا کہہ بندگی پیر مغاں کو
دُعا اس دُرد کش کی مئے کشاں کو

صبا ساقی سے جا میری دُعا کہہ
خمار اس کا رقیبوں سے چھپا کہہ

تعریف بنگالہ گل ولالہ کے ذکر کے بعد سرزمین بنگال کی تعریف وتوصیف ہے۔ شاید حضرت کمالؒ کو اس سرسبز وشاداب خطّہ سے کوئی قلبی لگاؤ تھا، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حضرات صوفیائے کرام نے اپنی تبلیغ ومشن کے لئے اس سرزمین کا انتخاب کیا اور اہلِ بنگالہ کے اندر قبولیتِ حق کی جو فطری صلاحیت تھی، اس چیز سے بنگال میں اسلام کی اشاعت بہت تیز ہوئی، جو تمام تر ان ہی اہل اللہ کی کوششوں اور اخلاص وخدمت کا ثمرہ ہے۔

" تعریف بنگالہ " کی سرخی کے تحت سیاحت بنگالہ کا شوق اور اہلِ بنگالہ کے ایثار ووفاداری اور محبت وشفقت کا ذکر اور اُن کے اندر کے صدق وصفا کی کمال مدح سرائی ہے۔ بنگالہ کو علماء وفضلاء کا مسکن اور فقراء، و اولیاء کا ملجا بتایا ہے۔ سلسلہ کلام میں بنگال کے مشہور اور متبرّک مقام پنڈوہ شریف کا ذکر کرکے وہاں کے شاہ صفی اور اُن کے ہمراہ سعدی ومہدی کا نام بہت ادب سے لیا ہے۔ معلوم نہیں یہ حضرات کون ہیں؟ لیکن خود شاہ کمال کو ان سے ایک تعلق خاص نظر آتا ہے۔ اپنے عقیدت مندوں کو بنگال کی سیاحت کی ترغیب دے کر تائیداً حضرت مخدوم جہاں بہاریؒ کی وصیّت پیش کی ہے۔ جو خود حضرت کمالؒ کے روحانی سلسلہ کے بزرگ ہیں۔ ساتھ ہی سرزمین بنگال کے چمنستان اور سبزہ زار کے حسن ودل کشی کی تعریف اور وہاں کے آب وہوا کی خوبی وخوب صورتی کا والہانہ انداز سے ذکر ہے۔ مثنوی کا یہ حصّہ حقیقتاً خطہ بنگالہ کی تعریف ومدح پر مشتمل ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ سرخی ہے تعریف بنگالہ میں — کہ خورشید واں داغ ہے لالہ میں

طلب ہے اگر تجھ کو واں جلد جا — کہ رہتے ہیں ہر دور میں اولیا

اگر دل میں تیرے کچھ بھی طلب ہے — گر درویش کا پاس ادب ہے

تو چل بنگالہ کو میں بھی ہوں ہمراہ — دکھاؤں تجھ کو ملک عشق کا شاہ

کئی ہر عصر میں ہوتے ہیں کامل — کہ اکثر ہوئے عرفاں کے قابل

سبب یہ ہے کہ واں اکثر صفا ہے — محبت، عجز اور صدق وصفا ہے

خصوصاً پنڈوہ حضرت شاہ صفی کا — وہاں ہے درس اسرار خفی کا

سبب یہ ہے کہ وہ فخرِ جہاں ہے　　مکان سعدیؔ و مہدیؔ وہاں ہے
وہ شمعِ انجمن ہیں مصطفٰے کے　　جگر گوشہ ہیں وہ شیرِ خدا کے

اگر گلخن ہے وہاں داغِ چمن ہے　　شرر کے لال سے کان یمن ہے
وہاں کا دشت کیسا دل کشا ہے　　ہوائے معتدل کیا جانفزا ہے
سیاحت جاکر مشرق زمیں کا　　تجلی دیکھو وہاں اہلِ یقیں کا
گذر ہے بیشتر صاحب دلوں کا　　وطن بلکہ اکثر کاملوں کا

تعریف عظیم آباد تعریف بنگالہ کے بعد شاعر نے عظیم آباد کا ذکر بھی اُسی والہانہ انداز سے کیا ہے اور کہا ہے کہ ؎

اگر بنگالہ تک جانا ہو مشکل　　عظیم آباد کو جا دیکھ کامل

اور پھر عظیم آباد کی سرخی کے تحت، اس شہر کی تعریف و توصیف یہاں کے اہل اللہ کے عشق کی گرم بازاری اور اہل عرفان و کامل کا ذکر خیر کیا ہے۔ پھر اس شہر کے حسن و دل کشی کا بیان ہے جو پڑھنے اور سُننے کے لائق ہے۔ نمونہ کے چند اشعار یہ ہیں ؎

شہر اسرار ہے عظیم آباد　　سرخی اوس کی بیاں ہے رکھ یاد
دیکھو جا کر وہاں کے کامل کو　　کیسے معمور ہیں، وہ عرفاں سو
عجب شہر ہے عظیم آباد اے یار　　سراسر عشق سے ہے گرم بازار
تڑپتے ہیں ہر ایک کوچہ میں بسمل　　نگاہِ دلبراں ہے تیغ قاتل
خراماں ہر طرف سرو گل اندام　　جدھر ہے قمری و بلبل کا ہے دام
تبسم زیر لب غنچہ دہن میں　　چمن آرا سبھی گل پیرہن میں
سواد اس کا ہے نورِ چشم جادو　　وہاں رم بھول جاویں چیں کے آہو
مگر صحرا وہاں کا نافہ زار ہے　　ہوا اس کی نسیم مشکبار ہے
زمیں کیسی شگفتہ ہو رہی ہے　　گویا فردوس کا گلشن یہی ہے

یقین حضرت کمال کی شاعری تمام تر عشق و محبت کی گرمی اور یقین کی روشنی سے منوّر ہے۔ اپنی مثنوی میں ایمان و یقین کی حقیقت اور فضیلت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک یقین سے عرفان ذات ہوتا ہے اور یقین ہی کا ثمر کمالِ معرفت ہے۔ یقین گدا کو شاہ بناتا ہے اور یقین سے راہ زن رہنما بنتے ہیں۔ غرض کہ یقین زندگی کی تاریکیوں میں روشنی بخشتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے نتائج فکر کو ۱۲ اشعار میں پیش کیا ہے ؎

یہ سرخی یقیں کے چمن زار کی — اسی گل سے بو آتی ہے یار کی
یقین گرچہ اوّل قدم ہے یہاں — یہ پہنچاوے منزل کے تئیں کارواں
یقین تخم خیالِ معرفت ہے — ثمر اس کا کمال معرفت ہے
یقین سے ہووے ممکن جو محال — یقین سے سرخوشی ہو جو ملال
یقین سے دل محیطِ آسماں ہے — یقین سے قطرہ بحرِ بیکراں ہے
یقین وہ ہے گدا کو شاہ کردے — چراغ غول شمع راہ کردے
یقین سے ہادیٔ کامل کو پہنچے — اگر وہ گم ہو تو منزل کو پہنچے
یقین سے کوہ دم میں کاہ ہو جا — یقین سے آسماں پر راہ ہو جا
یقین سے ذرہ خورشید فلک ہو — یقین سے مور کو بالِ ملک ہو

بارانِ اشک اُردو شاعری میں گریہ وزاری اور اشک باری، عشق و محبت کے اظہار کا ذریعہ اور غم والم کا وسیلہ رہا ہے۔ حضرت کمال نے اپنی مثنوی میں "اشک گل رنگ" کی سرخی باندھی ہے۔ آپ باکمال صوفی تھے۔ ان کی محبت، عشق الٰہی کا مظہر تھی، ان کے بارانِ اشک سے قلب کی سیاہی دھلتی ہے اور آتشِ قہرِ الٰہی کو بجھاتی ہے۔ ان کا سیلاب اشک نہ صرف صحرا کو سرسبز و شاداب بناتا ہے بلکہ اس بارانِ اشک سے "باغِ وفا" سرسبز ہوتا ہے۔ اس موضوع پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ ہے سرخی اشک گل رنگ دیکھ — ہوا لعل اس چشم سے سنگ دیکھ
کمال اے غرق سیل اشک خونیں — چمن اک قطرہ سے اس کے ہو رنگیں

اشکِ خونیں کے سیلاب میں حضرت کمالؔ اس طرح غرق ہیں کہ اُن کے اشک کے ایک قطرۂ خونیں سے پورا چمن لالہ زار اور رنگین ہے۔ اقبالؔ نے بھی "اشک پیازی" کی بات کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذّت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

دونوں اشعار کی خوبی اور فرق کو اہلِ فن ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں ؎

یہ باراں اشک کا دھوئے سیاہی ۔ بجھا دے آتشِ قہرِ الٰہی
عجب سیلاب ہے یہ اشک حسرت ۔ بہالے جاتی ہے نادریائے وحدت
نوازش حق کی اس گریہ سے ہوئے ۔ نہ پہنچا اس کے مطلب کو وہ کوہے
نہ تنہا اشک سے صحرا ہے سرسبز ۔ اسی باراں سے ہے باغِ وفا سبز
یہ اشکِ گرم کو تخمِ شرر ہے ۔ نہالِ درد کا آخر ثمر ہے

دردو آہ

آخری سرخی "دردو آہ" کی ہے۔ اِس میں آہ کی شرر باری اور دل گدازی کو ظاہر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی درد دل کے جذبات و اثرات اور عشق کے برکات کو پُردرد انداز میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یہ ہے سرخیٔ آہ اخگر فشاں ۔ یہ گل داغ سینہ کو دے ہے نشاں
غنیمت سمجھ ملنا اس مرد کا ۔ اثر جس کے نالہ میں ہو درد کا
کمالؔ اے سوزِ غم سے سینہ بریاں ۔ گداز دل سے ہر دم چشم گریاں
نہ رہ خاموش ہر دم آہ بھر آہ ۔ جو رہ گم ہو وہی جادۂ راہ
یہ نالہ کیا ہے سوز و سازِ عشق ہے ۔ کلید قفل گنج رازِ عشق ہے
یہ سوز نالۂ جاں سوز سُن کر ۔ جلے سینہ جہنم کا سراسر
یہ سوز سینہ کی دیکھو کرامت ۔ جلو میں آہ کے ہے صد قیامت

یہ دردِ آہ لبریزِ شرر ہے ۔۔۔ نہالِ عشق کو آخر ثمر ہے
کرے مقبولِ حق یہ آہ وزاری ۔۔۔ یہی مرہم ہو گر ہو زخم کاری
یہ سوزِ درد کب رونے سے جاوے ۔۔۔ کب آتش سنگ کے پانی بجھاوے
کہاں بے درد دیدہ خوں فشاں ہو ۔۔۔ کہ جڑ سے کوہ کے چشمہ رواں ہو
یہ سنگِ درد کا کس دل کو تاب ہے ۔۔۔ شررکا خس کے پرتو آفتاب ہے

حضرت شاہ کمال علی کمالؒ کی اُردو مثنوی کے تفصیلی مطالعہ سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں، مثنوی کے فکر وفن کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ جو کسی اعلیٰ معیار وفن کی مثنوی میں ہونی چاہئے۔ زبان کی سلاست وروانی، شاعرانہ حسن، فنکارآ انداز بیان سب کچھ موجود ہے، جو کسی اعلیٰ فن کا طرّہ امتیاز ہوتا ہے۔ فنّی اورادبی ومثنوی خصوصیات کے لحاظ سے حضرت کمالؒ کی یہ مثنوی، اُردو مثنوی کا بہترین نمونہ اوراُردو مثنوی کی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

سب سے بڑی خوبی اورامتیازی خصوصیت اس مثنوی کی یہ ہے کہ تقریبًا دوسو برس قدیم ہونے کے باوجود، دورِ جدید کی مثنویوں کی خصوصیات اوررجحانات کی حامل ہے۔ فرسودہ داستان حکایت نگاری سے ہٹ کر اعلیٰ خیالات، پاکیزہ جذبات اورروحانی مشاہدات کے اظہار کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ قدیم مثنویوں میں "مثنوی مولانا روم" اور دورِ جدید میں علامہ اقبالؒ کی مثنوی "ساقی نامہ" دونوں کی روح اورجذبے کی پرچھائیاں اورتجلیاں ان میں ملی گی۔ گویا قدیم فن اورجدید فکر کا حسین امتزاج ہے۔ فلسفہ، تصوف، عشق اوریقین کے مضامین کے ساتھ گل ولالہ کی بہار اورحسنِ فطرت کی مرقع نگاری کی بہترین شاہکار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت کمالؒ کی یہ مثنوی اردو مثنویوں میں ایک بہترین اضافہ ہے جو اپنے لازوال فن اوربے مثال انداز بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی اورساتھ ہی یہ مثنوی اپنی قدر وقیمت اورفکری وفنّی کارنامے کی بدولت تاریخِ شعروادب میں یادگار اورنمایاں مقام کی حامل رہے گی۔

حصّہ سوم

کلامِ کمالؒ

- غزلیات حضرت کمالؒ
  بہ التزام ردیف
- مثنوی حضرت کمالؒ

(۱)

گر عزم کرے اُس کی تجلّی کے بیاں کا
روشن ہی جلے شمع صفت تازہ زباں کا

کب تیر خطا ہوئے اس ابرو کے کماں کا
اس سینۂ زخمی سے سمجھ حال نشاں کا

ہے دل پہ مرے نقش کہ وہ نامہ سیاہ ہو
طالب جو ہوئے مثل نگیں نام و نشاں کا

دیکھے جو کوئی سینے میں اس تنگ دہن کو
کھُل جاوے ہے راز اُس کے اوپر دونوں جہاں کا

نقطہ پہ دہن کے کبھی اس خط کوں جو دیکھے
کب ہوش بجا رہتا ہے واں حاشیہ داں کا

کب قافلہ وادی کوں محبّت کی کرے طے
یاں بدرقہ حیرت سوں ہوا سنگ نشاں کا

زاہد نہ گرا مارا صفت زہرِ نصیحت
گر گنجِ محبّت نہ ہوئے کیا ہے طلسماتِ جہاں کا

(۲)

بیانِ عشق جو کچھ ہو بھی داستاں رہ جا
قلم شکستہ ہو چلنے کوں یہ زباں رہ جا

جو عمر گذرے بھی تو جسم ناتواں رہ جا
کہ قافلہ نہ رہے گردِ کارواں رہ جا

ہمارے فصل عجب کیا جو آکے لے جاوے
جو گل کے سوز محبّت سوں استخواں رہ جا

گلی میں مہرِ جبیں کے اگر گذر پاوے
یقیں ہے چلنے کوں واں پایہ آسماں رہ جا

کوئی جو تپ میں جدائی کے مبتلا ہوئے
کماں گل کے بدن چرم استخواں رہ جا

(۳)

گر کوئی اس لبِ رنگیں کا تبسم دیکھے
پردۂ ابر میں جا برقِ درخشاں رہ جا

گر چمن میں کبھی وہ قامت دلجو دیکھے
خم ہو کر سر صفت سرو گلستاں رہ جا

(۴)

جو اس کے چشم کے مژگاں کوں یک نظر دیکھے
جگر میں عمر تلک اس کے نیشتر رہ جا

چمن میں سرو کوں جب دیکھو راست قامت سے
خزاں ہمیشہ کو بے برگ و بے ثمر رہ جا

جو دیکھے زلف سیہ اس کی وہ وہیں مرجائے
یہ ناگ کالے کی او بن سوں کب لہر رہ جا

جو بوالہوس ہوئے میداں سوں وہیں چل نکلے
یہ معرکہ میں محبت کے بے جگر رہ جا

(۵)

میں ایسا زار و نزار ہوں اگر گروں بے شک
زمیں پہ خاک مری مثلِ نقشِ پا رہ جا

(۶)

تمام مدح علیؑ دیکھا جو رقم دیکھا
قضا قدر کوں دیکھا، لوح اور قلم دیکھا

اگر خدا نہ کہیں عارفاں یہ کھیتیں ہیں
علیؑ کو پادشہِ کشور قدم دیکھا

فراق یار کوں جیسا ستم کہ ہم دیکھا
کسی نے ایسا کسی پر کہاں ستم دیکھا

دہانِ تنگ مگر کچھ نہیں کی ہے صورت
وگرنہ کسی نے کہاں صورتِ عدم دیکھا

کہاں رکھے ہے قیامت فراق سیں[۱] نسبت
میں کیا کہوں کہ جدائی میں کیسا غم دیکھا

کسی کے چشموں سیں[۲] پیری میں کب بہے آنسو
کسی نیں[۳] روتے کہاں شمع صبحدم دیکھا

کھلے ہے موسم پیری جو دل ہوئے پُر خوں
شگفتہ ہونیں ہیں کل آپ صبحدم دیکھا

[۱] سے [۲] سے [۳] نے

(۷)

جگر کے ٹکڑے ہوئے سنتے ہی بیاں میرا
رکھے ہے لختِ جگر مثلِ گل دہاں میرا

کرے ہے دل میں مرے جلوہ دلستاں میرا
رکھے ہے داغ کے پردے میں مہ کتاں میرا

غذائے عشق ہوا جسمِ ناتواں میرا
ہوا ہے نذرِ ہما جسمِ استخواں میرا

یہ کیا سبب ہے کہ گلشن ہے شعلہ زار مگر
گیا ہے چھوڑ کے آتش کو کارواں میرا

شرابِ عشق سوں[1] بے خود ہوئے وہیں ساقی
سنے جو گوش سوں[2] دل کے کبھی بیاں میرا

میں کیو کہ اس کوں[3] پہچانوں وطن کروں وادی
چھپا ہے قافلہ میں میر کارواں میرا

نگین لعل لب اس کے اگر نظر میں نہیں
جہاں میں کچھ نہ رہے نام اور نشاں میرا

۱ سے ۲ سے ۳ کو

(۸)

جنھوں نیں[1] عارفِ کامل کو پیشوا دیکھا
اُنھوں نے بے شبہ اس آنکھ سوں[2] خدا دیکھا

جنھوں نے چشموں سے جا مشہدِ رضا دیکھا
قدر کے لوح کو، اور خامۂ قضا دیکھا

صبا کسی نے کہاں زلفِ مشک سا دیکھا
یہ بوئے اس میں کہاں نافۂ خطا دیکھا

کہاں حیات میں دیکھو بلند ہمت کوں
کبھی کسی نیں[3] جو دیکھا ہما ہوا دیکھا

کوئی بھی اُوڑ[4] کے کہیں پہنچا اوجِ عشق تئیں
کہاں سنا کہ کسی نیں[5] کبھی ہما دیکھا

۱ نے ۲ سے ۳ نے ۴ اُڑ کے ۵ نے

(۹)

غم موں[1] تیرے یہ بھی بلبلِ نالاں رویا
لختِ لختِ جگر اب غنچۂ خنداں رویا

یاد میں اس لبِ رنگیں کے میں رقت جو کئے
لعل خم ہو کے بہا، کوہِ بدخشاں رویا

دیکھ اس قد کوں[2] نہ ہو سجدہ موں[3] تہا قمری
سر کو رکھ پاؤں اوپر سروِ گلستاں رویا

آہ جاں بخشی کوں[4] سن کر تری اس لب کی صنم
رقتِ دل سوں نپٹ خضر بیاباں رویا

۱ میں ۲ کو ۳ میں ۴ کو

۱۰

جب صبا پہنچے وہاں کاکلِ مشکیں سُوں[۱] ترے ۔۔۔ سرنگوں ہوئے نپٹ آہوئے صحرا رویا
شور سُن کر کے صفا کا ترے دنداں کی صنم ۔۔۔ مُنہ چھپا دست صدف سوں دُرِ دریا رویا

۱؎ سے

۱۱

آہ زنّار بند دیکھ مجھے ۔۔۔ بہت حیرت سوں برہمن رویا
آہ ایماں سوں اس قدر گذرا ۔۔۔ کفر پر میرے برہمن رویا
سُن کر افسانہ میری رقّت کا ۔۔۔ آہ کر میرِ انجمن رویا
میری وحشت کوں[۱] دیکھ صحرا میں ۔۔۔ سرپٹک آہوئے ختن رویا
دیکھ کر چشم سرمگیں کوں تری ۔۔۔ زار زار آہوئے ختن رویا
زلفِ مشکیں کی تیرے بُو[۲] سوں صنم ۔۔۔ شور سُوں آہوئے ختن رویا

۱؎ کو ۲؎ بے

۱۲

اس قدر میں تڑپ کے جیوں کوں دیا ۔۔۔ خاک پر میرے آسماں رویا
خاکِ تربت کو دیکھ کر میری ۔۔۔ سرپٹک میرِ کارواں رویا
آہ میری کو سُن کے گلشن میں ۔۔۔ گر پڑا سروِ باغباں رویا
رقّتِ دل سوں میری آہ کمال ۔۔۔ بہہ گیا باغ، باغباں رویا

---

(١٣)

ہیں اس کے ملتے ہوا گم یہ اضطراب رہا — جو سیل پہنچا بھی دریا کو پیچ و تاب رہا
تو خود نما نہ ہوا اک دم کی زندگی اوپر — تمام روز کبھی دشت میں سراب رہا
چمکتی دیکھ کر اس بحرِ حسن کی موجیں — گہر کے چہرے اوپر کچھ بھی آب و تاب رہا
تو نقش آب اوپر ہے تجھے ثبات کہاں — کہ ایک دم کے سوا بھی کہیں حباب رہا
یقیں ہے زلف کے حلقہ سوں کون باہر ہو — کہ جس کے کوچے میں چلنیں سوں آفتاب[1] رہا

بیاں جو کیجے اسے بے شمار ہو دفتر
کمالِ جور کا ظالم کے کچھ حساب رہا

[1] چلنے

(١٤)

تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد — کہیں کسی کا محبت میں ننگ و نام رہا
جو دیکھا اُس لب رنگیں اوپر تبسّم کو — چمن میں بلبلاں کوں[1] گل سیتی[2] کچھ بھی کام رہا
زمانہ موج الف سوں[3] گیا دو بحرِ ساکن ہو — کہ بو جو بو کے تئیں عنبر و عود خام رہا

[1] کو [2] سے [3] سے

(١٥)

وہ کوہ سا ہے سیہ بخت جو کہ مطلب سوں — جنابِ عشق میں آ کر کے نا اُمید رہا

(١٦)

یا علی غم سوں سینہ چاک ہوا — دل گرفتارِ حسن پاک ہوا
آبِ رحمت کا اس پہ سیل بہا — جل کے تن آہ مشتِ خاک ہوا

۱۷

جو ایک دم بھی چمن میں وہ گلعذار[1] رہا — گلوں کے چہرے پر کب رنگ کا بہار رہا
میں کیونکہ صبر کروں اور بیقرار نہ ہوں — کسی کا عشق میں کچھ صبر اور قرار رہا
نگاہ ساقی کی دیکھا مگر کہ نرگس کا — نشہ اُوتر[2] گیا چشموں سوں[3] اب خمار رہا
جو عمر گذری رہے مشت خاک قالب کی — کہ گذرا بادیہ سوں[4] قافلہ غبار رہا
چمن سوں غنچہ دہن مسکراتے جب گذرا — گلوں کے چشم بھی حیرت سوں خار خار رہا
بہار خط سوں شکستہ ہوا دلِ گلزار — .... ریحان اوپر غبار رہا

۱؎ گل عذار ۲؎ اُتر ۳؎ سے ۴؎ سے

۱۸

غم سوں ہوا حواس پراگندہ اس قدر — اوراق جیوں[1] کے ہووے پریشان کتاب کا
دیواں لکھا ہے وصف میں چشموں کے اس سبب — ہر اک ورق پہ نقش ہے صاد انتخاب کا
آلودگی کہاں ہوئے نازک دلوں کے تئیں — کب تر ہوا ہے بحر سوں[2] دامن حباب کا
نازک دلوں کو تاب فغاں کی کہاں ہے آہ — ٹوٹے ہے دم کو لینیں[3] سوں جامہ حباب کا
معشوق بھی فغاں میں عاشق کے سوز سوں — نالاں کرے ہے آگ سوں روناں[4] کباب کا
تر دامنوں میں ہووے سبک سر سوں[5] جو ملے — رکھتا ہے فرش آب سوں خانہ حباب کا

۱؎ جوں ۲؎ سے ۳؎ لینے ۴؎ رونا ۵؎ سے

۱۹

عجب نہیں جو محبت موں[1] کر کے پانی سوں — ہمائے اوجِ جنوں میرا استخواں لے جا
جو دل میں شک کوں[2] نہ رکھ فیض بے قیاس اوٹھا[3] — یقین عالم معنی کوں، بے گماں لے جا

۱؎ میں ۲؎ کو ۳؎ اُٹھا

۲۰

کہاں تلک نہ ہو آشفتہ سنبل اور سمن — جو اُس کی زلف کی بُو باغ میں صبا لے جا
قدر کی راز سوں گر آگاہ وہ وہیں ہو جائے — قضا کسی کو اگر مشہدِ رضا لے جا
نسیم گلشن عشق حسینؑ امام کمال — یقیں ہے لاش مری دشتِ کربلا لے جا
راسے

۲۱

امام ضامن ثامن کہ ہیں امام رضا — سب ہی ہیں بندے وہاں گر قدر وگر ہے قضا
یقیں ہے زندہ دلی سن کے واں کے زائر کی — فلک سیں آویں زیارت کوں حضرت عیسیٰؑ
اجابت اوڑ کے گرے دست پہ کبوتر ہو — کوئی بلند کرے گر حرم میں دستِ دُعا
ملائک علوی ہیں وہاں کے طائر سب — نہ پہنچے اوج کبوتر کوں واں کے بال ہما
شکوہ گنبد عالی کا دیکھ عرش بریں — ہنوز زیر زمیں جا ہے خم ہو سر تا پا
وہاں کی رفعتِ گنبد کا کیا کروں میں بیاں — جہاں کی مور کا بیٹھا ہے عرش کا قبا
ملائکوں کی وے چشمیں ہیں انتظار سوں یہ — حرم کی گرد جو کھولیں ہیں نرگسِ شہلا
زمیں وہاں کی لطافت سوں اس بہار یہ ہے — چھپے ہے شرم سوں پردے میں جنّت الماوا
گلوں کے بوسے ہوئیں زندہ مردہ دل سارے — کہاں ہے جنّت فردوس کوں یہ لطف ہوا
مثال شمع کی جبریلؑ ایک پا پہ کھڑا — ہمیشہ بال سوں اپنے ہے مور چھل جھلتا
سواد گرد حرم کا ہے اس قدر روشن — کہ پڑھ لے خط کے تئیں سر نوشت کی اس جا
جہاں کہ حلقۂ در کا ہے عرش حلقہ بگوش — کہاں ہے رفعت و شوکت کوں انتہا اس جا
نہیں ہے مدح اماموں کی ہے یہ مدحِ خدا — ستارہ آئینہ باندھ ہاتھ دیکھئے اس جا
نہ آسماں ثوابت کوں کچھ رہی حرکت — جو سائبان مرصع کشیدہ واں دیکھا
جواہروں کی جو قندیلیں ہیں وے آئینے ہیں — کہ کچھ قیاس کسی کا نہ کام واں کرتا

عدد میں کہیے ستارے تو کس حساب میں ہیں
وہاں شمار ہوں کچھ نہیں رنگ و رہا کا
نہ پہنچے کو وہ بدخشاں جو لعل ہووے تمام
ہیں کیا بیان کروں قندیل کے جواہر کا
جہانکہ شمع کے پروانہ ہیں ملائک سب
نظر اُٹھا کے وہاں دیکھے کس کو ہے زہرا
وہاں کی شمع کے آگے ہے بدر کی قدر
جلے ہے مشعلِ خورشید صبح کو اس جا
وہاں کی شمع پہ فانوس اس قدر زیبا
کہ آستیں موں چھپے شرم سوں یدِ بیضا
وہاں کے حوض کی حیرت سوں لب پہ ہے انگشت
نہیں ہے کوثرِ جنّت کے لب او پر طوبیٰ
یہ آئینہ ہے کہ دیکھے جمالِ حق اس موں
نہ دیکھے آب وہاں چشم مردمِ بینا
یہ زخم دل کا مرے وہ نہیں کہ بہہ ہووے
کسی نے بستہ بھی دیکھا کبھی لبِ دریا
مگر امام رکھیں ایسے زخم پر مرہم
وگرنہ پہنچیں کہاں دردِ ہجر کو عیسیٰؑ

وہ آستانہ علیؑ پہ شرفِ جانِ کمال
عجب نہیں کھڑی ہو نوبت بے عصا موسیٰؑ

۱ سے ۲ کو ۳ اُڑ کے ۴ ہوئے ۵ آنے ۶ اتنی
۷ جہاں کہ ۸ کو ۹ سے ۱۰ پہنچے

(۲۲)

اُس لعلِ لب کا نقش ہے ملکِ یمن کے بیچ
اس زلف مشکبو کی بلا ہے ختن کے بیچ
اس زلف مشکبو سیتی جو پہنچی نسیم ہے
نافہ کی قدر کچھ نہ رہی اب ختن کے بیچ
پہنچا ہے شور اُس کے لبِ لعل کا مگر
اُوڑتی ہے خاک دیکھ تو کانِ یمن کے بیچ
ایسا خموش رہتا ہوں میں اس کے سامنے
گویا زباں کبھی نہ تھی اس کے دہن کے بیچ
کوچہ میں زلف کے جو موا، خونِ دل کوں کھا
کیوں داغ مشکبو نہ ہو اس کے کفن کے بیچ

۱ سے ۲ اُڑتی ۳ مرا ۴ کو

(۲۳)

دل بہہ کے موجِ اشک سوں ہے چشمِ تر کے بیچ
کشتی تباہ کرتا ہے دریا لہر کے بیچ

دنداں کی موج کیسی ہے دریائے حسن میں
یہ آب و تاب دیکھا کسی نیں گہر کے بیچ

سُن شورِ آب و تاب کوں[۱] دندانِ یار کے
موتی ہوا پھپھولا صدف کے جگر کے بیچ

تیرِ بلا کا سینۂ عشّاق ہے سپہر
آجاتے ہیں سمٹ کے سپاہی سپر کے بیچ

فریاد کس سیتی[۳] جا کے کروں کون ہے دادگر
آتا نہیں جہاں میں کوئی اب نظر کے بیچ

شیریں سخن وہی، جو کوئی پختہ فکر ہیں
تُرشی دلیل خامی ہے یعنی ثمر کے بیچ

۱؎ نے   ۲؎ کو   ۳؎ سے

(۲۴)

کوئی بھی اُڑ کے گیا بامِ آسماں کو پہنچ
کمندِ آہ سوں جا سکتا ہے وہاں کو پہنچ

دہن کے نقطہ کو اس خط سوں کر سکے دریافت
اُسی غبار سوں جا ملک کے نشاں کو پہنچ

یہ دشتِ عشق کا تنہا کہاں تلک طے ہو
مثال گرد کی اور میرِ کارواں کو پہنچ

یہ چشمِ زار کو میری کوئی بھی دیکھ سکے
ہُما عجب ہے جو لے جائے استخواں کو پہنچ

دہانِ تنگ کو اس کی سمجھ تو اے سالک
عدم کی راہ سے جاتے ہیں لامکاں کو پہنچ

(۲۵)

وہ لعلِ لب کا مگر شوق ہے نسیمِ یمن
ہوئی ہے چشم معطّر ادیم کے مانند

فراق بیچ کوئی دیکھے ہے بہارِ چمن
ہوئی ہے جنّتِ اعلیٰ جہنم کے مانند

میں رنجِ ہجر کا اس رتبہ کوں[۱] اُٹھاتا[۲] ہوں
ڈریں ہیں مجھ سے ہزاروں یتیم کے مانند

یہ طفلِ اشک پہ گردِ ملال ایسی ہے
عیاں ہے چہرے پہ کلفت یتیم کے مانند

۱؎ کوں   ۲؎ اُٹھاتا

(۲۶)

نسیم سوں بھی سبک تر ہوں گرچہ گلشن میں
گراں ہوں چشموں میں خوابِ بہار کے مانند

(۲۷)

میں جس کے پہلو میں بیٹھوں وہیں وہ نالاں ہو
فراق یار سوں ہوں آہ درد کے مانند

صدا جرس کی بھی اس بادیہ موں پہنچے نہیں
میں چھوٹا قافلہ سیں آہ گرد کے مانند

گرہ کوں غنچۂ دل کی خزاں موں کھولے ہے
نسیم صبح کہاں آہِ سرد کے مانند

۱۔ میں ۲۔ سے ۳۔ کو ۴۔ میں

(۲۸)

کہا نبیؐ نیں علی کرم سوں یقین کر جانو
کوئی جہاں میں نہ ہو گا شبیرؑ کے مانند

چمن میں اس لبِ رنگیں کے آہ غنچہ سب
ملیں ہیں خاکِ قدم کو عبیر کے مانند

۱۔ نے ۲۔ ملے

(۲۹)

کبھی سُنے جو کوئی سینہ اس کا جل جاوے
اثر رکھے ہے فغاں میری آہ کے مانند

مثال شمع کی گریاں ہو جو سُنے اِس کو
اثر رکھے ہے فغاں، میری آہ کے مانند

قدم پہ اس کے جو سالک ہیں راہ اُلفت کے
رکھوں ہوں سر کے تئیں خاکِ راہ کے مانند

ملے جو مردمِ بینا سوں اہلِ چشم کوئی
پلک میں پہنچے فلک پر نگاہ کے مانند

کوئی کسی کے قدم پر رکھے جو چشموں کو
....

کہاں تلک نہ ہووے جسم زار زار مرا
میں صرف گریہ ہوں ابرِ سیاہ کے مانند

۱۔ سے

۳۰

دماغ کچھ نہ رہا اب حباب کے مانند
میں پہنچا دشتِ عدم کو سراب کے مانند

اُوٹھایا اس رُخِ روشن سوں[۱] جب نقاب کے تئیں
ہر ایک ذرّہ ہوئے آفتاب کے مانند

فروغِ صبحِ تبسّم کا اُس کی گر دیکھے
تمام ذرّہ ہووے آفتاب کے مانند

یقیں ہے دورِ فلک، صاحبِ کلام جو ہو
اسی شکنجہ میں کھینچے کتاب کے مانند

یہ زہد خشک کوں[۲] اپنیں[۳] دکھاوے ہے دریا
فریب دیوے ہے زاہد سراب کے مانند

جو پختہ مغزِ محبت ہیں کب کریں فریاد
فغاں میں لاوے ہے خامی کباب کے مانند

فغاں کو سُن کے مری آہ کس کو تاب رہے
اگرچہ کانپوں ہوں تار رباب کے مانند

۱؎ سے ۲؎ کو ۳؎ اپنے

۳۱

ہر چند گل کی شمع صفت ہوں زبانِ درد
ممکن کہیں بیاں ہووے کچھ داستانِ درد

جاتا ہے راہ زہد کی کب کاروانِ درد
ہو ہے لبوں پہ مہر خموشی نشانِ درد

۳۲

ایک دم میں کوہ سرمہ کرے ہے شرارِ درد
یہ جسم زار کیوں نہ ہو جل کر غبارِ درد

چشموں سوں[۱] دیکھ پھولے گلِ شاخسارِ درد
اشک .... رنگیں سوں کیا ہے بہارِ درد

آ دیکھ تو صفائے محبت کو میرے شیخ
چھانا ہے اپنیں[۲] پردۂ دل سوں غبارِ درد

ایک دم میں کاہ خشک کرے کوہسار کوں
عاشق کہاں تلک نہ ہو زار و نزار درد

جیسا کہ دردِ چرخ میں رہتا ہوں بے قرار
مجمر میں کب سپند رہے ہے بے قرار درد

کیوں آکے جاں گسل نہ ہوا آہ و فغاں مری
جامہ ہوا ہے چنگ صفت تا رتار درد

۱؎ سے ۲؎ اپنے

(۴۳)

یعنی ہے آب و رنگ خجالت بہارِ عُمر ہے اشک سُرخ پھولا گُلِ شاخسارِ عُمر
جو آنکھ ہو تو دیکھو قیامت پلک میں ہے ہر دم اُڑے ہے پنبہ صفت کوہسارِ عُمر

(۴۴)

ملکِ عدم کو جاوے ہے ہستی سوں قافلہ موج ان دموں کی سینہ میں گردِ راہِ عمر
سرکش نہ ہو تو بحر سوں ظرفِ تنک کے ساتھ ایک دم میں جیوں حباب ہوا ہے کلاہِ عمر

(۴۵)

مستی کی جا خمار رکھے ہے شرابِ عُمر موجِ ہوا سوں ٹوٹے ہے جامِ حبابِ عمر
حاصل کہاں تلک ہو ہستی کی کشت سوں ایک دم میں آب ہو کے ہوا ہے سحابِ عمر
اس زندگی کے قِصہ کے تئیں مختصر کرو یعنی کہ اشک و آہ سوں ہے آب و تابِ عمر
غافل نہ ہو کماں ٹک اک چشم کھول دیکھ ہے آخرت کے دشت میں جوں سرابِ عمر

(۴۶)

جُز مشتِ خاک کچھ نہ رہے گا نشانِ عمر ملکِ عدم کو جاتا ہے یہ کاروانِ عمر
قِصہ اسی کا ہو کوئی کہتا ہے صبح کو پیری میں مختصر کرو اب داستانِ عمر
سرکش نہ ہوں[۱] توں[۲] ہستیٔ موہوم پر کبھی چُھپ جا گا زیرِ خاک ابھی آستانِ عمر
فرصت کہاں ہے سیر کی پیری موں[۳] باغ کی آوے ہے صبح ہوتے ہی فصلِ خزانِ عمر

۱ ہو ۲ تو ۳ میں

٣٧

وہ کاکلِ مشکیں ہے غضب آ ہوئے چیں پر
خوں ہو کے رکھا نافہ میں اب نافہ زمیں پر

خدمت میں تری خطِ غلامی لکھے عالم
مہتاب کو روشن ہے میاں داغ جبیں پر

٣٨

ہرچند کہ دل خستہ ہوں راضی ہوں رضا پر
گو خونِ جگر کھاتا ہوں شاکر ہوں قضا پر

ہر لحظہ صلوٰۃ اور سلام اپنیں[1] دلوں سیں[2]
بھیجیں[3] ہیں ملائک سرِ اقلیم رضا پر

کس اوج کو پہنچا ہوئگا[4] قفس نور بدن کا
حیرت نیں[5] گرہ دی ہے کئی بالِ ہما پر

اس سینہ کی ہر بیچ یوں ٹکڑے ہیں جگر کے
یا شاہ کرم کیجے کبھی مجھ سے گدا پر

ہر ذرہ پہ ہے نورفشاں کرۂ خورشید
اُس شہ کا ہمیشہ ہے کرم خیلِ گدا پر

وہ زلفِ سیہ ظلِّ الٰہی ہے میں سمجھا
کیوں شرف نہ اُس مُو کو ہوئے بالِ گدا پر

گلرنگ ہے وہ نرگسِ خونیں یہ عجب ہے
کب جمتا ہے لوہو[6] دمِ شمشیرِ قضا پر

عالی گہروں سیں[7] کہاں ہمسر ہوئے دوناں
کب چند پہنچتا ہے کوئی اوجِ ہما پر

۱. اپنے ۲. سے ۳. بھیجے ۴. ہو ۵. نے
۶. لہو ۷. سے

٣٩

اگرچہ رکھتی ہے منہ میں کبھی زباں نرگس
وہ چشم مست کا کب کر سکے بیاں نرگس

نہ چشم اُس کی نہ ابرو ہے نہ پلک بلبل
کہاں وہ چشم سیہ مست اور کہاں نرگس

عبیر سحر گوں رنگیں ہے جس کی جیبِ فکر
وہ چشم سوں کبھی پہنچے اے باغباں نرگس

کیا ہے چشموں نیں[؟] ظالم کے غنچہ بھر کے اسے
چمن میں پھولی ہوئی تھی جہاں جہاں نرگس

تمہاری چشم کوں سجدہ کرے غزالِ ختن
نہ ہوئے کیوں کہ میاں سرنگوں یہاں نرگس

وہ چشم مست کے آگے اسے ہے کیا رتبہ
چمن میں کاسہ خالی ہے دیکھ واں نرگس

۱ نے

۴۰

گرہ کے زر کے تئیں اپنیں[1] سب لٹا نرگس
کھڑی ہے باغ کے کوچہ میں ہو گدا نرگس

ہوئی ہے چشموں پہ ساقی کی مبتلا نرگس
لئے ہے ہاتھ پہ سر ایسی ہے فدا نرگس

وہ چشم مست حیا آکے کیا ملا نرگس
کہا کسی نہو[2] ناؤں اے حیا نرگس

کیا ہے چشموں نیں[3] ظالم کے اس قدر بیمار
زمیں سے اُٹھتی ہے لے ہاتھوں عصا نرگس

کسے ہے تاب کہ وہ چشم سُرمگیں دیکھے
نہ کھول چشموں کو اپنیں[4] اے بے حیا نرگس

نثار کر گرہ اپنیں[5] کے سیم و زر کے تئیں
کرے گی جان و دل اس چشم پر فدا نرگس

کبھی ہے دیکھا مگر خواب میں وہ چشموں کوں
رہے ہے باغ میں کیوں زرد رُو سدا نرگس

سُنا جو چشموں سیں[6] ساقی کی بارش مئے ہے
لئے ہے ہاتھ پہ کاسے کوں جیوں گدا نرگس

نگاہِ مست ہے ساقی کی موجِ آبِ گہر
کہاں رکھے ہے وہ چشموں کی سی جلا نرگس

جو دیکھا چشم کوں[7] اُس گل بدن کی گلشن میں
کٹی زباں سوں[8]، اگر ہے اثر دُعا نرگس

۱ اپنے ۲ نہ ہو ۳ نے ۴ اپنے ۵ اپنے
۶ سے ۷ کو ۸ سے

(۴۱)

کہاں کسی سے ہے زہرا کرے بیان فراق
لے جاوے خواب عدم سنتے داستانِ فراق

یہ دشتِ غم میں کہاں تک رہے قدم ثابت
کہ آ گرے ہے مرے سر پہ آسمانِ فراق

پڑی ہے غم کے تلاطم میں صبر کی کشتی
عبور کیوں کہ کروں بحرِ بیکرانِ فراق

مثالِ شمع کی ایک دم میں شعلہ ہو جائے
کہاں ہے تاب زباں کو کرے بیانِ فراق

کوئی بھی بحر کوں قطرہ میں لاوے ممکن ہے
کہاں کسی سوں بیاں ہووے داستانِ فراق

نگین دل کا مرے گم پڑا ہے مدت سوں
خدا کرے نہ رہے نام اور نشانِ فراق

(۴۲)

کس کو خبر ہے آہ مرے داغِ عشق کی
خاموش ہو کے جلتا ہے یعنی کبابِ دل

دیکھا ہے جب سوں سرخیٔ پاں خوں ہو بہ چلا
اس لعل لب سو پوچھو کے جا آب و تابِ دل

ہر حرف اس کا جوہرِ شمشیر دیکھ لو
ہے بابِ دردِ زخمِ محبت کتابِ دل

نام اس کا لو تو دھو لیو منہ گلاب سوں
یعنی کہ سب جابوں سیں پاک ہے جنابِ دل

اب بھی تو دے وہ اپنے سے کچھ نمک
غفلت سوں لے چلا ہے دیا یہ کبابِ دل

آتش بلند کیوں نہ کرو داغِ عشق کی — جلنے ہی میں رکھے ہے مزا یہ کبابِ دل

کوہ آہ آتشیں کے ہوئے سیخ خام ہے — بے سوز داغ پختہ نہ ہووے کبابِ دل

جو داغِ عشق اس کو کہو یا کہ کچھ کہو — رکھتا ہے اپنے جیب موں اک آفتابِ دل

اب چاہنا نمک کا تبسم بھی اُس اوپر — اُس لعل آتشیں سوں ہوا جو کبابِ دل

جو ہے مزا سو اس کے تبسم سوں ہے کمال

چاہے اس لخت دل پہ نمک یہ کبابِ دل

١ سے ٢ اپنے ٣ نہ ہووے ٤ میں ٥ سے ٦ سے

٤٣

روتا ہے مثلِ شمع کے زار و نزار دل — اس زلف سوں زیادہ ہے اب بیقرار دل

رقت سوں اب نہیں رہا کچھ اختیار دل — کب رہ سکے ہے صبر یہاں اور قرار دل

زلفوں کو دیکھتے نہ رہا اب قرار دل — ہرگز نہیں ہے یک سرِ مو اختیار دل

کرتا ہے نرم موم سوں سوز و گداز عشق — کیوں غم سوں مومو نہ ہوبے اختیار دل

٤٤

جاتا نہیں وہیں سوں یہ سوزِ داغِ دل — روشن ہے صبح حشر تلک یہ چراغِ دل

ہے اس کی قید زلف موں یعنی فراغِ دل — کب صرصرِ زمانہ بجھادے چراغِ دل

یک داستانِ عشق ہے یعنی کتابِ دل — نازک ہے بوئے گل سوں بھی یعنی دماغِ دل

٤٥

پاک میں ہوں مجھے صفا کی قسم — غم میں بے خود ہوں میں خدا کی قسم

دیکھ اس غنچہ لب کو ہنسنے میں — دل شگفتہ ہوا صبا کی قسم

قافلہ، کارواں کی کیا حاجت — راہ دل میں ہے رہنما کی قسم

(۴۶)

یہ سیلِ اشک میں باقی ہے مشتِ خاک کہاں — بہوں مَیں خس کی صفت بحرِ بیکراں کی قسم
غزل موں[۱] کیا کہوں حیرت سوں[۲] ہر سخن میرا — گرہ زباں پہ ہوا، نقطۂ دہاں کی قسم
رکھوں ہوں قاف سوں[۳] ہستی کے اس قدر وحشت — میں گزرا نام سوں[۴] عنقائے بے نشاں کی قسم
صدا جرس کی نہیں پہنچی آج تک مجھ کوں[۵] — میں گردِ راہ ہوا میرِ کارواں کی قسم
جو راست باز ہیں اس چار باغ ہستی میں — خزاں ہمیشہ رہے سروِ بوستاں کی قسم

۱؎ میں ۲؎ ، ۳؎ ، ۴؎ سے ۵؎ کو

(۴۷)

کوئی لے جاوے کہاں اس تلک تمام کہاں — مجالِ حرف کہاں، رتبۂ سلام کہاں
نگہ سوں اس کے دو عالم شبیہ ہے بے تیغ — سنا کسی نے کہاں ایسا قتلِ عام کہاں
اسیرِ زلف کے پیچوں میں عالی ہمت ہیں — بچھایا کس نے ہُما آہ ایسا دام کہاں
چلی ہے دشتِ ختن میں کہ بُو کرے نافہ — صبا نے بُو کیا وہ خطِ مشک فام کہاں
خمار بوئے دو عالم کا اُس کے نیم نگاہ — وہ چشم مست کہاں اور مئے کا جام کہاں
کہاں تلک یہ معطر ہوئے دماغِ سخن — کہ فکرِ پختہ کہاں اور عود خام کہاں
رہے جو زلف کے کوچہ میں صبح کب دیکھے — پہنچ سکے ہے سیاہی کو اس کو شام کہاں
فلک کو ظلم ہے کب باز رکھ سکے ہے ہلال — کہ پختہ کب ہوئی بے عشق فکرِ خام کہاں
مقامِ مہدیؑ ہادی کو کیوں کہ پہنچوں میں — کہاں امامِ زماں اور یہ غلام کہاں
نگیں کو اُس لبِ رنگیں کے جب سے دیکھا ہوں — نشاں کہاں رہا کچھ، اور نیک نام کہاں

(۴۸)

لے جاوے باد یہ سوں اس شکستہ پا کے تئیں — یہ قافلہ میں کوئی ایسا اب رحیم کہاں

شگفتہ کر دیا اک دم میں دل کے غنچہ کو
یہ آہِ سرد کہاں، صبح کی نسیم کہاں

(۴۹)

کہاں ستارہ سحر کا یہ پشتِ دست کہاں
کہاں یہ نرگسِ مخمور، چشمِ مست کہاں
کہاں تلک کوئی سمجھے، وہ بیتِ ابرو کو
کہاں دو مطلع کو پہنچے ہے فکرِ پست کہاں
گذر گیا ہوں دو عالم سے اِک چھلانگ میں میں
کہاں جہاں سے ہے عنقا کو ایسا جست کہاں

(۵۰)

شکار کیوں نہ ہو اُس دام کا غزالِ ختن
کہاں یہ زلفِ سیہ اور مشکِ ناب کہاں

(۵۱)

چمن میں دیکھو کہ شبنم ہے مرہم کافور
کہاں یہ سینۂ پُر داغ، لالہ زار کہاں

جو انجمن میں نہ ہو چشم مست ساقی کی
شکستہ ساغرِ مئے سے ہووے خمار کہاں

تبسّم اس لبِ رنگیں سے کس کو ہوش رہے
کسی نے باغ میں دیکھا ہے یہ بہار کہاں

ہوا ہے تشنہ جگر، خضر و چشمۂ حیواں
کہاں یمن میں ہو، یہ لعل آبدار کہاں

(۵۲)

کہاں کسی کو میسّر ہوئے وصال کہاں
کہ دیکھا خواب میں یوسف نے یہ جمال کہاں

جو دیکھے یوسف مصری، ہووے گریباں چاک
کسی نے خواب میں دیکھا ہے وہ جمال کہاں

تبسّم اس لبِ رنگیں کا کس بہار پہ ہے
چمن کا سبزہ لے جاوے کہاں ہلال کہاں

کشش اگر نہ ہو صیّاد کی کہاں پہنچوں
وہ صیدِ ماہ کہاں، وہ شکستہ بال کہاں

جو ہے کریم اُسے حاجتِ سوال کہاں
دمِ مسیح ہیں اعجاز، یہ کمال کہاں

(۵۳)

کہاں یہ آہ سے کم ہووے سوزِ داغ کہاں
ہوائے تُند بجھاتی ہے یہ چراغ کہاں

بہار رکھتا ہے بے گل عذار باغ کہاں
چمن کی سیر کا بُلبل صفت دماغ کہاں

تبسّم اُس لبِ رنگیں کا بھولے کب عاشق
گلوں سے بلبلِ گلشن کے تئیں فراغ کہاں

(۵۴)

یا علیؑ دور کر ملال کے تئیں
دفع کر ہجر کو ملال کے تئیں

سخت بیتابی سے تڑپتا ہوں
جلد دکھلادے اُس جمال کے تئیں

(۵۵)

بہار کیا ہے جو گُل رونہ ہو چمن کے تئیں
کہ جوں سپند ہے اس غم سے اب سمن کے تئیں
شکار آپ سے ہو دام زلف مشکیں کا
وہ بُو جو پہنچے کبھی، آہوئے ختن کے تئیں
جو دیکھے اس خطِ شبگوں کو لعلِ لب بہ عجب
کہ دم میں ہندسوں پہنچے ہیں ہم سجن کے تئیں

(۵۶)

یا علیؑ دیکھوں حسن پاک کے تئیں
وے اثر آہ دردناک کے تئیں
دل ہوا آب آہ رقّت سے
اب ملا یار شرمناک کے تئیں

(۵۷)

اس تیر کا نشاں کرے گوشہ نشیں کے تئیں
ابرو کمان جوزہ کرے چیں جبیں کے تئیں
عاشق کی تشنگی، کہیں جاتی ہے آب سے
دکھلا نہ بحرِ موج سے چینِ جبیں کے تئیں
عاشق کے تئیں بلا سے ہے آفت تو کیا خطر
کیا خوف سیل سمرّہ ہے صحرا نشیں کے تئیں
اُس لعلِ لب اوپر خطِ روشن کو دیکھ کر
ہے دل میں نقشِ خاتم جم کے نگیں کے تئیں
سُن اضطراب کو مرے گرداب سے کمال
روتا ہے بحر چشم پہ رکھ آستیں کے تئیں

(۵۸)

کہاں ہے کاسہ دریوزہ اس گدا کے تئیں
کہاں ہے برگ نوا، مجھ سے بے نوا کے تئیں
صبا جو دیکھے کبھی زلف مشک سا کے تئیں
یقیں کہ بُو نہ کرے نافۂ خطا کے تئیں
خطر نہ ہوگا کبھی وادیٔ محبت میں
تو رکھ لے چشم کے محمل میں رہنما کے تئیں
وے کس کی قید میں آوے جو عالی ہمّت ہو
کہ طرہ کرہ کریں شاہ کیوں ہما کے تئیں

کمال عنبر و سنبل و مشک غالیہ ہم
نہ پہنچے نکہتِ گیسوئے دلربا کے تئیں

(۵۹)

کبھی سُنا نہیں تو نورِ لامکاں کے تئیں
وطن تو سمجھے ہے اس تیرہ خاکداں کے تئیں

جو ابرو اپنے کے کھینچے کبھی کماں کے تئیں
کبھی غلط نہ کرے تیر اک نشاں کے تئیں

تو جانِ چرخ کی نعمت کی منتظر ہے مریض
یہ وہ بلا ہے کہ کھاوے ہے میہماں کے تئیں

ہما تو رہیو کہ وہ ترک تیر غمزہ کا
کبھی نشانہ کرے میرے استخواں کے تئیں

فضائے کون و مکان کیا ہے آگے دلدل کے
ملک سوں کم نہ کرے طے وہ لامکاں کے تئیں

جواہروں کا عدد جانے گر محال نہ ہو
شمار نقطۂ اختر حساب داں کے تئیں

چھپے عدم موں خجالت سوں کھاکے خونِ جگر
کلی جو دیکھے وہ رنگینیٔ دہاں کے تئیں

تو اس سرا میں ہے کیوں تنہا وقت پیری کے
کہ صبح ہوتے ہی چلتا ہے کارواں کے تئیں

وہ غنچہ پھول ہوئے کھاکر اپنا خونِ جگر
جو کل سُنے کبھی، رنگینیٔ دہاں کے تئیں

سپندِ ہوش، ترا تیر کس طرف جا ہے
تو دشتِ مدح کے تئیں پھیر اب عناں کے تئیں

کہاں یہ پاکی کے قابل دہاں کی مدح کے ہو
کرے گلاب سوں گر شست و شو دہاں کے تئیں

(۶۰)

جہاں کے گل سے بہارِ جناں جواں کے تئیں
چمن میں واں کی کہاں راہ ہے خزاں کے تئیں

زمینِ پاک نجف کو عجب لطافت ہے
یہ آب و رنگ کہاں گلشنِ جناں کے تئیں

جہاں کی مور کا دانا ہے عرش کا گنبد
مثل دے کس سے کوئی پاک آستاں کے تئیں

تباہ حال مرا سب ہے شاہ پر روشن
میں کیا کہوں کہ کروں گا بیاں عیاں کے تئیں

کھلے ہے صبحِ قیامت تلک گرہ اُس کی
سُنے جو غنچہ کبھی، تنگیٔ دہاں کے تئیں

تو اعتقاد سے آ دیکھ کیا ظہور ہے یاں
یقینِ ملک کی کب راہ ہے گماں کے تئیں

مثال شمع کی رشتے کی دم میں جل جاوے
کہاں ہے تابِ بیاں اس سخن زباں کے تئیں
کبھی جو نام مخالف کا سہو سوں گذرے
قطع کروں میں وہیں اپنی اس زباں کے تئیں
میں جل گیا ہوں محبت کے سوز سے اپنی
سراب جانے ہیں اس جسمِ ناتواں کے تئیں
وہ اوجِ بے خودیٔ عشق کو کہاں پہنچے
ہُما جو دیکھے کبھی میرے استخواں کے تئیں
کئے ہیں قافلہ غارت، وہ چشمِ کافر نے
خدا بچاوے یہ زہروں سے کارواں کے تئیں

(۶۱)

ادا و زلف و خط و خال راہزن چاروں
نگاہ و غمزہ، مژہ، چشم تیغ زن چاروں
عقیق لب نے صنم کے کیا ہے زیرِ نگیں
کنشت و کعبہ و زاہد و برہمن چاروں
کیا ہے خاتمہ رنگیں دہن نے زیرِ نگیں
پری و مور و سلیمان و اہرمن چاروں
ہوئے ہیں اس لبِ رنگیں کے شور سے بے رنگ،
عقیق و لعلِ بدخشان اور یمن چاروں
سیاہ چشم و خط و زلف و رُخ نے محو کیا
بنفشہ نرگس و سنبل و یاسمن چاروں
کمر و فرق و بدن پہ ہے کس قدر زیبا
کلاہ و طرہ، کمربند و پیرہن چاروں
فدائے دلبر بالا بلند ہیں گے کمال
یہ سرو طوبیٰ و شمشاد و نسترن چاروں

(۶۲)

بر آوے آہ و اثر دود اور شرر چاروں
بر آوے شاخ و شجر، برگ اور ثمر چاروں
بہا سے اس لبِ شیریں نے ہی گرا ہے دیا
نبات و قند و مصری و گل شکر چاروں
تباہ آویں ہیں، دریائے عشق میں کشتی
تلاطم اور لہر، باد اور بھنور چاروں
کہاں یہ بوئے دل آویز خط کے تئیں پہنچے
بنفشہ غالیہ و عنبر و شکر چاروں
عجب کہ بادیہ موں، عشق وسیلہ نہیں
یہ زاد و راحلہ و راہ و راہبر چاروں
تمام مدح علیؑ ہے رقم جہاں دیکھو
میں دیکھا لوح و قلم اور قضا قدر چاروں

سیاہ پلکوں نے ظالم کے کر دیا بے کار — خدنگ و نیزہ و شمشیر اور تبر چاروں
نجف کے گرد حرم، چار سو عیاں دیکھو — کلیم و طور و تجلّی کو اور شجر چاروں
یہ پہنچی اُس کے تبسّم کے روشنی کے تئیں
کمالؔ مشتری و خرُ دمہ، شجر چاروں

(۶۳)

دیکھا ہے نخل آہ کے تئیں بے ثمر کہیں — دیکھا کسی نے سینے میں اپنا جگر کہیں
مارا پڑا ہے آج تلک نامہ بر کہیں — کس نے کبھی سُنا ہے ستم اس قدر کہیں
عاشق کو کب ہوئے ہے عزیز اپنا سر کہیں — اس کو نہیں ہے خوف کہیں اور خطر کہیں
ملتی نہیں ہے یار کی مجھ کو خبر کہیں — جاوے ہے دل کہیں و پریشاں نظر کہیں
جا انجمن میں آہ ہے نامہ گرا دیا — اُس نامہ کی کسی کو نہیں کچھ خبر کہیں
اُڑتا پھروں ہوں دشت میں جیوں گرد کارواں — منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہبر کہیں
اب میں چلا ہوں ہاتھ پہ رکھ اپنے سر تئیں — لیکن نہ ہو قبول مرا سر اگر کہیں
تب کیا کروں کوئی بھی کہے مصلحت مری — ورنہ میں کاٹ ڈالوں گا جا اپنا سر کہیں
کہنے لگے جو دل سے مرے دوستدار بھی — آتا ہے اضطراب کوئی اس قدر کہیں
اے آہ کون لے جا مرا نامہ اُدھر کبھی — قاصد کی آج تک نہیں ملتی خبر کہیں
قاصد تو کیا بلا ہے کہ جس کا یہ نامہ ہے — اک دم میں اُس کا دھڑ ہے کہیں اور سر کہیں
گذری ہے سر پہ میرے قیامت کی شب کمالؔ
مل جاوے صبح ہوتے ہی شمشیر و سر کہیں

(۶۴)

یا علیؑ دل موں کچھ بھی تاب نہیں — بیقراری سوں شب کو خواب نہیں
ہجر کا کیا عذاب ہوتا ہے — آہ دوزخ کا کچھ حساب نہیں

۶۵

یا علیؑ سخت اضطراب میں ہوں
موبہ مو غم سوں پیچ و تاب میں ہوں

۶۶

شیرازۂ نارِ جان رکھے ہے کتابِ حُسن
برسے ہے اُس کی چشموں سے یعنی شرابِ حُسن

۶۷

کب مدح کی لکھنے کی ہے تاب اہلِ قلم کو
لرزش میں وہیں لاوے ادب لوح و قلم کو

گر پیلِ فلک دیکھے کبھی بحرِ الم کو
جا پہنچے وہیں مور ہو سوراخِ عدم کو

گر کھینچے کمر سے کبھی اس تیغِ دو دم کو
روبہ کی صفت شیرِ فلک بھاگے عدم کو

اس شاہ کے دلدل کے سوا کب ہے یہ ممکن
طے کر سکے حادث کوئی صحرائے قدم کو

خورشیدِ فلک صبحِ قیامت ہوئی فانوس
پروانہ ہوئے روحِ ملک شمعِ حرم کو

دم مارے یہاں صبح فروغ اپنے کیا تاب
مُرچھل جھلے ہے مہرِ فلک شمعِ حرم کو

غارت کروں میں اپنے ہی عشق کے رہ میں
اس واسطے کرتا ہوں طلب فوجِ ستم کو

عشّاق کا مانی کا نہ کر شکوہ اے زاہد
یعنی کہ بجھا دم سے کبھی شمعِ حرم کو

حادث کو عبور اس کے کرم سے ہوئی ممکن
ہر چند کنارا نہیں دریائے قدم کو

جب قدرتِ ایجاد کے تئیں اپنی دکھاویں
ہرگز نہ رہے کچھ بھی نشاں نام عدم کو

جو قطرہ گرہ ہو گئے ہیں بحرِ گلو میں
پیتا ہوں ہر اک دم میں میں سیلابِ الم کو

دل سُنتے نہ گھل جاوے وہیں سوزِ سخن سے
جیوں شمع جلا دیوے اگر رشتۂ دم کو

۶۸

کب سوز مرا لکھنے کا زہرا ہے قلم کو
انگشت بجلے شمع صفت اہلِ رقم کو

کہتا ہوں میں اُس شاہ کی کھا کر کے قسم کو
بے شاہ کے دیکھوں نہ کبھی باغِ ارم کو

ہم چشم حباب ہیں گے مگر زاہدِ بے داد
دیکھا ہے کسی نے کبھی اس چشم میں نم کو

قائم رہیں سرسبز ہو اولادِ علیؑ کی
جب تک کہ جلا دے نہ قضا چرخ کے دم کو

نیساں کے کئی قطرے گہر ہوتے ہیں یعنی
ہے قطرہ کا جا بارشِ دُرا برِ کرم کو

دریوزہ گر اُس در کے ہوئے قیصر و خاقاں
کیا رُتبہ ہے شاہانِ عرب کو نہ عجم کو

بیخود ہو کے دریائے محبّت سے گہر نے
جب ڈوبے ہیں غوّاص گرہ کرتے ہیں دم کو

اُس در کی گدائی میں ہے کیا شوکت و حشمت
جاتے ہیں گدا نقشِ قدم مسندِ جم کو

عالم کے تئیں گو ہر مطلب ہوئے حاصل
گر جوش میں لاوے کوئی دریائے کرم کو

کچھ حد و حساب ہے وہاں ریزش کو گہر کے
یعنی کہ کنارا نہیں دریائے کرم کو

مکتب میں محبّت کے لیا درس جنوں نے
دو حرف سمجھتے ہیں وہ بہجت و غم کو

کب عاشقِ دل سوختہ اس رہ میں کھڑا ہو
کب گرم روی دیوے جلا برق کے دم کو

(۶۹)

بیخود ہوئے بلبل مرے نالہ کے اثر سوں
پہنچا نہیں کچھ اُس کا اثر غنچہ دہن کو

(۷۰)

یا علیؑ جلد لاؤ دلبر کو
یعنی دکھلاؤ اپنے مظہر کو

یا علیؑ کچھ بھی رحم آتا ہے
دیکھ کر میرے حالِ ابتر کو

(۷۱)

بے داغ کے کب آہ جگر پاوے اثر کو
خورشید کرے پختہ ہر ایک خام ثمر کو

کیا روز ہے اس اشک کو ..... کئی ابر کو
میں کیا کہوں اس طفل کی اپنے سے جگر کو
کیوں سینہ سُبک ہووے نہ اس تیرِ نگہ سوں
کب ..... جو ہوئے روبہ سر کو
اس اشک کے سیلاب میں کیا موجیں ہیں دیکھو
دریا بھی کئی بھر گئے اس دیدۂ تر کو

(۷۲)

کب سمجھے ہے عشاق وطن تیرہ زمیں کو
کیا جاتی ہے جز..... دود عرش بریں کو
سو ٹکڑے جگر اس کا ہو مانند کتاں کے
مہتاب جو دیکھے کبھی اس مہرِ جبیں کو
اُس کاکلِ مشکیں کا خم و پیچ بَلا ہے
ہر موئے ہے زنجیرِ گلو آہوئے چیں کو
بے دین کیا شیخ کو کاکل نے صنم کی
زنّار گلو پیچ ہے اب کعبہ نشیں کو
اُس کاکل مشکیں میں جو ہے بوئے دل آویز
یہ بوئے دل آویز کہاں نافۂ چیں کو
دکھلا کے تبسّم کے نبُیں لعلِ لبوں کے
بے نام و نشاں کر دے سلیماں کے نگیں کو

(۷۳)

کبھی جو غنچہ دہن جا چمن میں خنداں ہو
اُڑیں گے شاخ سوں گُل عندلیب نالاں ہو
اگرچہ صبحِ قیامت ہو، وہیں شام ہو جائے
جو زلف چہرے پہ اُس کے کبھی پریشاں ہو
جو دل گداز نہ ہو، روشن ہو وقت پیری کے
سحر کو شبنمِ گلزار، مہرِ تاباں ہو
پلادے خونِ جگر، اس کی سوں اُسے شربت
کوئی بخیل کے گھر میں کبھی جو مہماں ہو
سخن سوں پیری کے عقدہ دلوں کے کھلتے ہیں
نسیمِ صبح سے گلشن میں غنچہ خنداں ہو
خزاں بہار ہمیشہ اُسے برابر ہے
چمن سوں سرو صفت جو کشیدہ داماں ہو

(۷۴)

صبا جو پہنچے نجف کو دمِ مسیحا ہو
جو دیکھے واں کی تجلّی کو، وہیں پہ موسیٰ ہو
جو سیلِ اشک مرا، واں تلک کبھی پہنچے
تمام دامنِ صحرا بھی مثلِ دریا ہو

کہاں تلک کے صفا بخشے سوزِ آتشِ عشق / گداز کرنے سے آخر کو، سنگِ مینا ہو
مثال آہ کے اُڑ جاوے سروِ گلشن سوں / کبھی چمن میں اگر وہ بلند بالا ہو
عجب کہ اُس کا دہن کچھ سمجھ میں آہ نہیں / جو نکتہ داں ہیں، سمجھیں ہیں، گر معمّا ہو
گدازِ تن سے ہویدا ہو وسعتِ مشرب / شکست ہونے سے ساحل کے جوئے دریا ہو

(۷۵)

جنابِ حضرتِ دل عرشِ کبریا دیکھو / خودی سوں اپنے گذر، خانۂ خدا دیکھو
فریب دیو ہے ناداں کو زُہد سوں زاہد / خدا کی راہ میں یہ غول رہنما دیکھو
ہوا ہے ہادیٔ عالم کا شیخ راہ کو بھول / پہن یہ بادیہ موں، گرد رہنما دیکھو
قضا وہاں کی ہے فرماں موں اس قدر جانو / رضائے حق میں رہو شہیدِ رضا دیکھو
جنابِ عشق کو کچھ ربط جسم زار میں ہے / یہ استخواں کے اوپر سایۂ ہما دیکھو

(۷۶)

پڑا ہے بحر میں جا شور اس کے دنداں کا / صدف میں قطرۂ آب ہو گیا گُہر دیکھو
کمال اس کے تئیں آرزو نجف کی ہے / کبھی بھی شاہ مری طرف، اک نظر دیکھو

(۷۷)

جنوں کی جذبہ کو اور جسمِ ناتواں دیکھو / ہُما کے پنجہ میں اب میرا اُستخواں دیکھو
جو کاکلوں کا ہے مطلب اُسے وہاں دیکھو / جو کچھ ہے پردۂ اسرار میں عیاں دیکھو
کشیدہ پیشِ حرم زر کا سائباں دیکھو / ادب سوں خم ہے ثوابت کا آسماں دیکھو
بلند بس کہ ہے اے دل، جنابِ شاہنشاہ / قدر نصیب بسا دل، قضا وہاں دیکھو
صنم کی زلف سوں، کفر اس قدر بلند ہوا / فلک کے دوش پہ زنّار کہکشاں دیکھو
عیاں ہے سینۂ عاشق سوں جلوۂ معشوق / بدن میں ماہ کے پیراہنِ کتاں دیکھو
شکن موں زلف کے عاشق کے دل کو راحت ہے / ہُما کا سرو سہی، پر یہ آشیاں دیکھو

ثمر ہے صحبتِ ظالم کا رنجِ بے تابی — اثر سوں تیغِ سرگشتہ بر فشاں دیکھو
نگہ نے اُس کی کیا رُخنہ؛ یہ ستارے سوں — فلک کے سینے کو اِس تیر کا نشاں دیکھو
یہ سیلِ اشک میں بہتا ہے خستہ دل میرا — شکستہ کشتی و دریائے بیکراں دیکھو
نجف کے گرد کی نہروں میں کیا لطافت ہے — کہ خشک اس کے سبب جوئے کہکشاں دیکھو
جلا ہوں عشق کی آتش میں اے ہما ایسا — مثال عود کے خوشبوئے استخواں دیکھو
ہوئے ہیں چلّہ نشیں، دیکھو اُس کے تیرِ نگہ — مکانِ امن و اماں گوشۂ کماں دیکھو
یہ راہِ عشق میں ہو خضر سا مگر رہبر — کھڑا ہے دشت میں حیراں ہو کارواں دیکھو
نسیمِ عشق سوں پہنچی ہے اُڑ کہیں سے کہیں — زمیں پہ خاک مری ہے نشاں، کہاں دیکھو

(۷۸)

سمجھ شباب کے تئیں موسمِ بہار نہ سو — کرے گی خواب گراں تجھ کو زینہار نہ سو
چمن کہیں ہے گلِ ہر سحر نگار نہ سو — پلک کے لگنے میں جاوے گی یہ بہار نہ سو
مثال قافلۂ عمر جاوے غفلت میں — یہ بادیہ ہے خطرناک زینہار نہ سو
نہ ہو جوانی میں غافل کہ پیری آ پہنچی — مثال آوے خزاں موسمِ بہار نہ سو
چمن میں بوئے دل آویز کیسی آتی ہے — نہ سو تو صبح کے تئیں، موسمِ بہار نہ سو
جرس کے شور کا مضموں یہی ہے لے سالک — کہ راہِ عشق میں رہزن ہیں بے شمار نہ سو
رباب و چنگ سوں مستوں کو یہ صدا آوے — کہ رنج دیوے گا آخر کے تئیں خمار نہ سو
یقیں کہ مُردہ ہو جاؤں گا مثلِ خاکستر — کہ ایک دم کا یہ جینا ہے جیوں شرار نہ سو
کرے جو خواب یہاں ایک دم میں مار پڑے — یہ آسماں نہ ہو، رہزن کا ہے حصار نہ سو
طپش اگر نہ ہو مجھ میں اس فلک کے رہا — ...... کی فغاں کر شہید وار نہ سو
یہ بادِ صبح میں پیری کی دل کبھی بجھ جائے — مثال شمع کی کر گریہ، زار زار نہ سو

(۷۹)

یا علیؑ، یارِ مہرباں لاؤ — مُردہ قالب میں پھر کے جاں لاؤ

(۸۰)

یا علیؑ، یا رسولؐ جُدا نہ کرو
ہجر میں پھر کے مبتلا نہ کرو

(۸۱)

یا علیؑ مجھ کو اب اس خلق میں رُسوا نہ کرو
جیب و دامن کو مرے رونے سے دریا نہ کرو

(۸۲)

یا علیؑ، مجھ کو سر فراز کرو
عشق کے من موں میرے راز کرو
زندگی میری گو نہ ہوئے کوتاہ
یار کی عمر کو دراز کرو،

(۸۳)

کوچہ میں، زلف میں، یہ مجھی کو اسیر دیکھ
کئی سینہ چاک، شانہ صفت دستگیر دیکھ
جا کربلا میں، جلوۂ حضرت شبیرؑ دیکھ
اس خاک رہ کے جیب و گلو میں عبیر دیکھ
اُس نوجواں کی قامتِ دل کش کو دیکھئے
تو سرو پشت دوتا مثلِ تیر دیکھ
پھرتے ہیں لے کے کاسۂ دریوزہ ہاتھ میں
.... کر کے حقیر رتبہ کو شاہ و وزیر دیکھ

(۸۴)

ایسی ہے بے قراری، دلِ دردمند کو
مجمر میں اس قدر ہے بھلا کب سپند دیکھ

---

(۸۵)

اس لعل لب کی یاد سے زہرہ ہو مُردہ دل — یادِ سمن سے ہو ہے معطّر ادیم دیکھ
مدّت ہوئی کہ جلتا ہوں آتش میں ہجر کی — میری طرف کرم کی نظر سے کریم دیکھ
دل کی مرے گرہ نہ کھُلی، آہ سرد سوں — ہر صبح عقدۂ غنچہ کے کھولے نسیم دیکھ

(۸۶)

کشیدہ قامت وہ سروِ نونہال کو دیکھ — کلف سوں چہرۂ مہتاب ہر ہلال کو دیکھ

(۸۷)

چشم اس کی کہنے..... زار و نزار کو ں — سوزن کو کیا اُٹھائے ہے تیغِ اصیل دیکھ
چلتا ہے قافلہ ابھی آواز دم سوں سُن — بجتا ہے وقت خواب کے طبل و رحیل دیکھ

(۸۸)

بے خود کرے ہے خواب سوں موسم بہار کا — ساقی کی چشمِ مست کو عہدِ شباب دیکھ

(۸۹)

مجلس میں مطربوں کا بھی سُنتے نہیں سرود — ساقی کی چشمِ مست کو زاہد فریب دیکھ

(۹۰)

اس زلفِ مشکبُو کے تئیں بے قرار دیکھ — خیلِ غزالِ چیں کے تئیں دل فگار دیکھ
عہدِ شباب، چہرہ پہ خطِ غبار دیکھ — سبزی کا لطف باغ میں فصلِ بہار دیکھ
مرنے کے بعد بھی نہ گیا دل کا اضطرار — تڑپے ہے آج تک مری خاکِ مزار دیکھ

...... گر نہ ہو بنفشہ زمیں گیر باغ میں
سجدہ کرے غزالِ خطِ مشکبار دیکھ

نغمہ کی جائے نالہ بھریں نغمہ سنجِ مست
مثلِ رباب جامہ مرا، تار تار دیکھ

عاشق کی چشم ہر سو ہے خرّم بہارِ حُسن
سر سبز ہمیشہ سروِ لبِ جوئبار دیکھ

اس گلبدن کی یاد میں روتا ہوں اس قدر
رنگیں ہوا ہے اشک سوں جیب و کنار دیکھ

گلشن میں اس کے حُسن کی شوکت ہے کس قدر
یعنی جلو میں سرو چمن جوئبار دیکھ

۹۱

پاکی یہ چشم کی مری ظاہر ہے اشک سوں
صافی صدف کے سینہ کے آبِ گہر سوں دیکھ

لختِ جگر ہے چشم کے کاسہ میں جلئے ماں
بادشاہ اس گدا کو کرم کی نظر سوں دیکھ

مژگاں مری پھرتے ہیں اک قطرہ اشک سوں
آتش کدہ پلک میں ہوئی اک شرر سوں دیکھ

گر بحرِ بیکراں میں خدا، ناخدا ہوئے
کشتی بھنور میں جاوے، ایمن خطر سوں دیکھ

کرتا ہوں یادِ غنچہ دہن ہر دم اس سبب
لبریز ہے وہیں مرا لختِ جگر سوں دیکھ

۹۲

طاقت کہاں کسی کو رہے وہ جناب دیکھ
شبنم کو کب بقا رہے ہے آفتاب دیکھ

اُس سر کو سرِ ماہی مثلِ حباب دیکھ
اُس چشم زار کو مری، موجِ شراب دیکھ

معشوق سیم تن کو کرے عشق ناتواں
کاہیدہ ہو ہلال، ہوئے ماہتاب دیکھ

دریائے سوں گہر کو جو کوئی جدا کرے
ہو جاوے ایک دم میں وہ خانہ خراب دیکھ

معشوق بیقرار ہو عاشق کے سوز سوں
آتش فغاں میں آوے ہے اشکِ کباب دیکھ

ممکن ہے نیستی کے تئیں دیکھنا کمال
ہستی کو اس جہاں سے تو مثلِ سراب دیکھ

۹۳

چہرے پہ مہر کے غم سوں کتاں کا رومال دیکھ
داغِ کباب ماہ ہوا ہے ہلال دیکھ

اس زلف کی شکن موں قیامت طلسم ہے
ہیں بند اس کے کوچہ میں صبا عجب کمال دیکھ

قمری و سروِ سایہ صفت کرو پر کرے
گلشن میں خوش خبرا سے وہ نونہال دیکھ

کلفت عیاں ہے غم کے یہ طفلِ سرشک سوں
چہرے پہ اس تبسم کے، گرد ملال دیکھ

کیا رنگ یاں سوں اس دُرِ دنداں میں ہے چمک
ابرِ بہار یہ رق کے رُخ پر وبال دیکھ

(۹۴)

برسے ہے چشمِ ساقی سوں مستی شراب کی
داغِ جگر میں پاتا ہوں لذّت کباب کی

ریحان دل میں کیوں نہ غبار ہووے اس سبب
قیمت شکستہ کر دیئے خط میں کتاب کی

اس چہرے کی صفا کو جو دیکھا ہے خواب میں
پروائے اب کہاں رہی مخمل کو خواب کی

عاشق تمام شورشِ غش رہوئے دیکھ کر
شورہ زمیں سے ہووے نمائش سراب کی

لختِ جگر ہے سوختہ آنسو یہاں کہاں
باد صبا سوں چھوٹے ہے چشمیں حباب کی

(۹۵)

دیکھے جو کبھی دیر میں ابروئے صنم کی
بیتاب ہو سجدہ کرے محراب حرم کی

دیکھے جو کبھی اس لبِ رنگیں کا تبسم
گر جاوے خجالت سوں نگیں خاتمِ جم کی

رستم نہیں گر کوہ ہوئے کب ہو مقابل
آوے جو الم کر کے کبھی تیغ ستم کی

کیوں فکر موں ہے بیہودہ اس تنگ دہن کے
رکھتا ہے کوئی کچھ بھی خبر ملکِ عدم کی

سوگند سوں کب نرم ہوئے وہ دلِ سنگیں
پروائے کہاں بُت کو برہمن کی قسم کی

(۹۶)

پیری میں کب افسردہ نہ ہو داغ جگر کی
گُل ہوتے ہیں محفل میں دیکھو شمع سحر کی

ہرگز نہ رہے نور حباب آوے جو تیرے
خاموش ہوئے شمع دیکھو وقت سحر کی

صحبت میں غنی کی رہے مفلس تو حقیر ہو
فرسودہ شتابی سوں ہوئے بار گہر کی

٩٧

تنہا نہیں اس لب خجلت سوں لعل بدخشاں / گم ہوگئی خجلت سوں سلیماں کی نگیں بھی
اس کا کل مشکیں کا کمند ایسا دراز ہے / باقی نہ رہے دشت میں اک آہوئے چیں بھی
تنہا نہیں میں عشق کی گردش موں موا ہے / سرگشتہ ہے اس بادیہ موں عرش بریں بھی
میں اُس بُتِ کافر کا برہمن نہیں تنہا / اب دیر نشیں ہوگئے سب کعبہ نشیں بھی

٩٨

معشوق تیغِ علم کا خونخوار چاہیئے / دل دار و دل نواز و غم خوار چاہیئے
عاشق ہمیشہ درد سوں بیمار چاہیئے / بیزار زندگی سے زار و نزار چاہیئے
عاشق کے سر پہ ظلِّ ہُما گو نہ ہو، نہ ہو / اس کی گلی کا سایۂ دیوار چاہیئے
سروِ سہی کو کام ہے کچھ برگ و بار سوں / آزاد دل کو دوشِ یقیں بار چاہیئے
عاشق کو ناز غنچہ دہن گلبدن سوں کام / جو عندلیب ہو، اُسے گلزار چاہیئے

٩٩

قلندری سوں مگر سرورِ راست ہے ورنہ / کوئی ہمیشہ جہاں بیچ نوجواں نہ رہے
جہاں کہ داغ محبّت ہے خیلِ غم واں ہے / جہاں کہ آگ نہ ہو قافلہ وہاں نہ رہے
لکھا ہوں خونِ جگر سے میں اپنے دیواں کو / عجب کہ روئے زمیں پر یہ داستاں نہ رہے
نشاں نہ پاوے وہ مطلب کا راست باز جو ہو / چلے بہ سیر اگر پشت خم کماں نہ رہے
نگینِ دل پہ جسے نام علی کرم کا نقش نہ ہو / یقیں کہ اس کی جہاں بیچ کچھ نشاں نہ رہے
تبسّم اُس لبِ رنگیں کا دیکھ اے بلبل / چمن میں غنچہ کی رنگینی وہاں نہ رہے
فراقِ یار میں رنج ایسا کچھ اُٹھایا ہوں / یقیں کی حال مرا قابلِ بیاں نہ رہے
قدِ بلند کا اس گلبدن کے شور کو سن / چمن میں قمری و بلبل کا آشیاں نہ رہے

چمن سوں رنگ اُڑے ایسا دیکھ اُس لب کو
که رحم گل کے لبوں پر بھی رنگ پاں نہ رہے
عجب کہ جامہ اس قد کو دیکھ دیدہ رہے
چمن میں شور کو سُن، سروِ بوستاں نہ رہے
کہاں ہے پاکیِ مشربِ کمالؔ کو حاصل
کہ آب پاک کہاں، چشم گر رواں نہ رہے

(۱۰۰)

بہ نقدِ دم کو نہ کھو، عمرِ جاوداں نہ رہے
طلسمِ گنجِ رواں پر نگاہ باں نہ رہے
گذار پاوے ہے معشوق داغِ عاشق سوں
کہاں ہلال ہوئے ماہ پر کتاں نہ رہے
خیالِ یار کا رہتا ہے چشمِ گریاں موں
جہاں کہ چشمہ نہ جاری ہو کارواں نہ رہے
کبھی تو آوے گی اُس دل میں سرخوشی کی بہار
ہمیشہ باغیچہ موں، موسمِ خزاں نہ رہے
یہ کیا ہے سُرعت تک معنی سیر دل بہ دل سوں
مکاں تو کیا ہے کہ اک دم میں لامکاں نہ رہے
کہاں اُٹھاوے ہے ظالم کبھی بھی ظلم سوں ہاتھ
فلک کے ہاتھ میں کب تیغِ کہکشاں نہ رہے
جو وصل ہو بھی میسّر تو کیا کہوں احوال
دو چار یار کے مُنہ میں مری زباں نہ رہے
عجب کہ موسمِ پیری موں خوابِ غفلت ہو
کہ صبح ہوتے سرا بیچ، کارواں نہ رہے
یہ راہِ عشق موں تنہا نہ جا کہ منزل کو
نہ پہنچے قافلہ گر میرِ کارواں نہ رہے
جو چاہو صاحب جوہر ہو خاکساری سوں
رواں کہاں سے ہو شمشیر گر فساں نہ رہے
کبھی جو دیکھے اُس ابرو کی کج کلاہی کو
کمر میں چرخ کی شمشیرِ کہکشاں نہ رہے
کمالؔ اس لبِ جاں بخش کے تبسّم کو
کبھی جو دیکھے، یہ رنجورِ ناتواں نہ رہے

(۱۰۱)

چشم سوں آہ مری اشک کے گر موج اُٹھے
شور اس سیل کا سُن جوششِ دریا نہ رہے
حجرۂ شیخ ہی، وہ صحنِ خرابات نہ ہو
بزمِ مستوں میں اگر ساقی و مینا نہ رہے

پردۂ دل ہے کہ نہ ہو دیدہ ابد یک ہرگز — یاد جس دل میں اگر زلف سمن سا نہ رہے
اس قدر شور ہے اس لعل کی جاں بخشی کا — چرخ پر سنتے وہیں آہ مسیحا نہ رہے
کیے رکھے شمع حرم حاجتِ فانوس وہاں — آستیں بیچ یقیں ہے یدِ بیضا نہ رہے
کس قدر جذب دل اس چشم سیہ مست میں ہے، — دیکھتے اُس کے رمِ آہوئے صحرا نہ رہے

اس قدر وضعِ جہاں سے مجھے نفرت ہے کمالؔ
قاف سوں قاف تلک، نام کو عنقا نہ رہے

(۱۰۲)

عجب کہ یاد میں وہ زلفِ مشک سا نہ رہے — یہ کون سر ہے کہ جس سر میں یہ ہوا نہ رہے
بجائے شمع جو ساقی و دلرُبا نہ رہے — یقیں کہ محفلِ مستوں میں کچھ صفا نہ رہے
خدا کرے کہ کہیں اس کا کچھ نشاں نہ رہے — جسے کہ نادِ علیؑ کرم شادا نما نہ رہے
یقیں کہ شاہیِ کونین اُس کے تئیں بخشے — جو اس کے در پہ کرے سجدہ وہ گدا نہ رہے
کہاں ہے روح میں عشاق کی نشانِ قرار — کہ دشتِ ریگ رواں بیچ نقش پا نہ رہے
نہ ہوئے عشق میں کب چاک جیب و دامنِ صبر — بدن میں برق کی جیوں ابر کی قبا نہ رہے
فراقِ یار میں کس جا کھلے دلِ عاشق — جو نہی بادیہ میں آہ کچھ فضا نہ رہے
نسیم کا کلِ مشکیں سوں گر وہاں پہنچے — کبھی بھی دشت میں پھر آہوئے خطا نہ رہے
جو آہ سرد مری واں تلک کبھی پہونچے — چمن میں صبح کے تئیں جنبشِ صبا نہ رہے
جو راست باز ہیں اس دور میں رہیں عریاں — بدن میں سرو کے ہرگز کبھی قبا نہ رہے
یہ راہِ عشق ہے بے راستی کے طے نہ ہوئے — گر ہے کور، اگر ہاتھ میں عصا نہ رہے
جسے شعور ہے کچھ بھی وہ اس قدر جانے — قضا ہے کچھ بھی اگر بندۂ رضا نہ رہے
یہ بادیہ ہوں محبت کے بے دلیل نہ جا — کہ کارواں کو خطر ہے جو رہنما نہ رہے
خطر ہے بحرِ خرد میں اگر نہ ہوئے جنوں — جہاز غرق ہو گر اُس میں ناخدا نہ رہے
فراقِ یار میں عاشق کا دل کھلے کس جا — جو صحنِ گلشنِ فردوس میں فضا نہ رہے

دوامِ وصل میسّر ہو کس کے تئیں اے دل
ہمیشہ کاہ کے ہمراہ کہربا نہ رہے

کہاں زمیں پہ گرے جو بلند ہمّت ہو
کہ شاخِ نخل پہ ہرگز کبھی ہما نہ رہے

۱۰۳

باغ میں ساقی کے شاید نرگسِ سرشار ہے
کس قدر آشفتہ سر ہر گل کے اب دستار ہے

صبحِ محشر ہے تبسّم اُس لبِ مے گوں کے تئیں
چشمِ خواب آلودِ ساقی فتنۂ بیدار ہے

ناتواں دیکھا ہے شاید چشمِ ساقی کے وہاں
اِس قدر گلشن میں نرگس اس سبب بیمار ہے

وجد میں کب آوے گر واں نغمۂ داؤد ہو
زاہدِ بے درد گویا صورتِ بیمار ہے

کیا تبسّم اُس لبِ جاں بخش کا اعجاز ہے
شورِ حُسن اُس کا مسیحا چرخ پر بیمار ہے

۱۰۴

دل پہ چلی جوں اشک یہ کیا سوز بیاں ہے
دم لینے سوں جیوں شمع کے جلتی یہ زباں ہے

کچھ شمع کی شعلہ سوں نہیں کم یہ بیاں ہے
مانندِ فتیلہ کے یہاں جلتی زباں ہے

جب پشت دوتا ہوئے تو یا تیر فغاں ہے
کب تیر خطا ہووے ہے کو تولے کماں ہے

اس دل کے تئیں درد سوں کب تابِ بیاں ہے
احوال خرابی کا مری تم پہ عیاں ہے

سوسن کی صفت کیک ہے کو جیہ موں زباں ہے
اِس ابرِ سیہ بیچ، کوئی برقِ تپاں ہے

ہے دل میں مرے نقشِ نگیں وہ لبِ رنگیں
اب کس کے تئیں چہرۂ ہوش نام و نشاں ہے

دریائے محیط ہے، یہ عجب، یہ کہ ہے جاری
جس چشم کے چشموں میں کھڑا سرو رواں ہے

اس پنجۂ مژگاں میں کیا چشم کو خونیں
آہو نہ ہوئے دیکھ تو یہ شیر ژیاں ہے

عاشق کو کہاں حاتمِ جم نقش ہو دل پہ
گو نافہ سیہ ہے، وہ بے نام و نشاں ہے

مسجد ہے یا دَیر ہے اے شیخ و برہمن
کچھ مجھ کو خبر نہیں ہے کہ یہ کون و مکاں ہے

رشتہ سوں محبت کی ہے پیوند دلوں کا
مہتاب کے سینہ سوں مگر بارِ کتاں ہے

دل چُور نہ کر سنگِ نصیحت سے اے ناصح
خاطر پہ مری حرف سبک بارِ گراں ہے

بیتابیٔ عاشق پہ جلے ہے دلِ معشوق مہتاب کے سینہ کو دیکھو داغِ کتاں ہے

(۱۰۵)

کبھی چمن کی طرف جب وہ خوش خرام آوے سہی قدوں میں وہ خوش قد گویا امام آوے
جو دیکھے قامتِ دل کش کو اس کی سروِ چمن کمر کو باندھ کے دامن کو جیوں غلام آوے
سخن میں اُس کے اثر ہو نفس معطّر ہو زباں پہ جس کی کبھی شہ کا پاک نام آوے
کبھی جو زلف پریشاں ہو اس کے چہرے پر یقیں ہے صبحِ قیامت پہ وہیں شام آوے
کماںؔ لچھمن و رام آکے وہیں بندے ہوں
کبھی زباں پہ صنم کے جو رام رام آوے

(۱۰۶)

کو نین مری آنکھوں میں تیرہ نظر آوے جس دم کے تئیں یادِ شبیر و شبر آوے
وہ غنچہ دہن سیرِ چمن موں اگر آوے گُل نذر کو دامن میں لے لختِ جگر آوے
گر غنچہ دہن مجھ کو چمن میں نظر آوے آنسو کی جگہ چشموں سوں لختِ جگر آوے
غنچہ کی صفت ہاتھ موں اس کی جو زر آوے ممکن ہے جہاں میں کبھی ایسا بشر آوے
جو صبح ہو خورشید تو ہے ایک گھر آوے جس جا کے اوپر بیٹھے، وہاں کارگر آوے
قاتل جو کبھی قتل کو مری اِدھر آوے شمشیر گذر سر سے مری تا جگر آوے
شمشیر کو غمزے کی الم کر اگر آوے وہ ہی ہے سپاہی، جو یہاں بے سپر آوے
عرقا ہووے سہی سرو جو وہ قد نظر آوے ورنہ عرقِ شرم اسے با کمر آوے
شبنم ہوئے الماس مگر غم سوں کہ ہر صبح مُنہ نیچ ہر ایک غنچہ کے لختِ جگر آوے
اس زلف کے کوچے میں نہ جا شیخ تو ہرگز جاوے جو کوئی واں تو کہاں پھر کے گھر آوے
احوال مرا سُن رہے کب تاب بیاں کی جب محفل ماتم میں مری نوحہ گر آوے
بتیاب ہو جیوں فاختہ کو کُو لگے کرنے جب سیر کو وہ قامتِ عالی نظر آوے

دیکھے جو کبھی شیخ برہمن ہووے وہیں
بُت خانہ سوں گروہ جو ہندو بشر آوے

(۱۰۷)

بیاں میں حالِ پریشاں مرا کہاں آوے
یقیں ہے قطرہ میں کب بحرِ بیکراں آوے

خبر جو اُس قدِ دل جو کی گر وہاں آوے
مثالِ آہ کی خود طوبیٰ اور جناں آوے

خیالِ یار کے تئیں، دل میں کب ہے گنجائش
کہ آفتابِ فلک ذرّے میں کہاں آوے

اُسے ہمیشہ بہار ہے جو برگ و بر نہ رکھے
یقیں کے سروِ چمن پر کہاں خزاں آوے

نہ ہو نشانہ کبھی تیر آہ کا اُس کے
کہ جس کی پشت دوتا غم سوں جیوں کماں آوے

اونھیں ہمیشہ بہار ہے جو محو حیرت ہیں
کبھی بھی گلشنِ تصویر میں خزاں آوے

فلک کے ہاتھوں سے کب سربخت ہوہے کوئی
کہ کشتِ زار کو کب جوئے کہکشاں آوے

جو فیض دیوے ستم گر کو آپ سے گذرے
فنا موں، تیغ سوں، فرسودہ ہو فشاں آوے

کرے ہے جوہرِ معشوق جلوہ، عاشق سوں
صفائے تیغ کو ممکن ہے بے فساں آوے

کھڑا ہے قافلہ حیرت میں مثلِ سنگِ نشاں
خدا کرے کہ ابھی میرِ کارواں آوے

(۱۰۸)

فلک کے رونے سے میری لبِ آب ہو جاوے
زمیں اور مشتری و مہر و مہ آب ہو جاوے

کبھی جو مہر جبیں بے نقاب ہو جاوے
ہر ایک ذرّہ وہیں آفتاب ہو جاوے

دہن کا نقطہ صنم کے عجب معمّا ہے
یہ نکتہ سنتے ہی سینہ کباب ہو جاوے

شرابِ عشق کی اک جام پینا مشکل ہے
کہ شیخ جرعہ سے اس کے خراب ہو جاوے

صبا جو بُو کو وہ زلفوں کی واں تلک لے جا
تمام مشکِ ختن خونِ ناب ہو جاوے

قدم پہ زاہدِ مشہد کی گر کرے سجدہ
جبیں کا داغ وہیں ماہتاب ہو جاوے

کبھی جو مالی میں عشاق آویں صوفی سب
صدا کی سنتے ہی تارِ رباب ہو جاوے

میں گر دہوکے نرڑ پتا ہوں تشنگی سے کمال
عجب نہیں ہے کہ خود رہ شراب ہو جاوے

(۱۰۹)

یہ بادیہ کا محبت کے قطع مشکل ہے
جو قافلہ میں کبھی میرِ کارواں نہ ہوئے
نزولِ عشق کہاں ہو جو چشم زار نہ ہو
ہما کب آوے زمیں پر جو استخواں نہ ہوئے
نہ دیکھ چشمِ حقارت سے میرے دیواں کو
عجب کہ عرق عرق سروِ بوستاں نہ ہوئے

(۱۱۰)

میں وحشی ہوں بیاباں کی قسم ہے
مجھے اُس پاک داماں کی قسم ہے
قیامت فتنہ ہے یہ دورِ دامن
ترے عطرِ گریباں کی قسم ہے
بہا جاتا ہے سیلِ اشک میں دل
مجھے دریائے عمّاں کی قسم ہے
برہنہ پا پھروں دشتِ طلب میں
مجھے خارِ مغیلاں کی قسم ہے
میں نخلِ دردمند بے برگ و بر ہوں
مجھے سروِ گلستاں کی قسم ہے

(۱۱۱)

میں بسمل ہو گیا تیغِ الم سوں
تڑپتا ہوں میں تنہا کی قسم ہے
نمایاں گرد ہوں وحشت سوں ہر دم
مجھے آہوئے صحرا کی قسم ہے
لبِ لعل اُس کے جاں بخشی سخن سوں
دمِ اعجازِ مسیحا کی قسم ہے
چمن میں شورشِ قمری ہوئی سرد
مجھے اُس قدِ رعنا کی قسم ہے
میں گذرا کوہِ قاف آسماں سوں
تن وحشی ہوں عنقا کی قسم ہے
یہ زلفِ عنبریں صیدِ بلا ہے
مجھے گردابِ دریا کی قسم ہے
تبسّم سوں جلا اُس مردہ دل کو
تجھے خضر و مسیحا کی قسم ہے

(۱۱۲)

کبھی جو اہلِ بصیرت کی اک نظر ہو جائے ‏— جو بے ہنر ہو وہیں صاحبِ ہنر ہو جائے
وہ نونہال کا گر باغ میں گذر ہو جائے ‏— نہال باغیچہ بے برگ و بے ثمر ہو جائے
فراقِ یار کبھی دل میں یاد اگر ہو جائے ‏— ہزار ٹکڑے اَلم سے وہیں جگر ہو جائے
خبر جو اس لبِ جاں بخش کی مسیح سُنے ‏— خبر پہنچتے ہوئے وہیں بے خبر ہو جائے
کبھی جو تیغِ ستم کی الم کرے ظالم ‏— تمام سینۂ عالم، وہیں سپر ہو جائے
کبھی جو گذرے چمن کی طرف سہی بالا ‏— تمام قمری گلشن شکستہ پر ہو جائے
جو خاکِ راہِ نجف اس کی چشم تک پہنچے ‏— اگرچہ کور ہوئے صاحبِ بصر ہو جائے
نجف کی رفعتِ گنبد کو گر کبھی دیکھے ‏— تمام قبۂ افلاک خمّ بر ہو جائے
ہوس جو صاف ضمیروں میں آئے عشق ہوئے ‏— جو قطرہ کامِ صدف میں پڑے گہر ہو جائے

(۱۱۳)

قضا جو پہنچے وہیں بندۂ رضا ہو جائے ‏— قدر کبھی مرقدِ عالی پہ جاں فدا ہو جائے
چمن میں جاتے لگی ایسی آنکھ شہلا کی ‏— بدن کا جامہ وہیں نرگس قبا ہو جائے
نسیم کاکلِ مشکیں سوں آ ہوئے چیں پر ‏— فضائے بادیہ وحشت سوں تنگنا ہو جائے
کبھی جو دیکھے فلک کی طرف وہ مہر جبیں ‏— زمیں پہ گر کے وہیں ماہِ نقشِ پا ہو جائے
نسیم فضل سوں کشتی تباہ قلزم کو ‏— ہر ایک موجِ تلاطم میں ناخدا ہو جائے
چمن میں اوج کے تئیں کیا بیاں کرے کوئی ‏— پڑے جو چغد اُوپر سایہ وہ ہما ہو جائے
کوئی بیاں کرے ممکن ہے اوجِ عشق کے تئیں ‏— جو استخواں پہ پڑے سایہ وہ ہما ہو جائے

(۱۱۴)

آزاد دلوں کو کہاں ساماں کی خبر ہے ‏— لنگر نہ ہو دریا میں کسے کون خطر ہے

اس اشک سوں کب کسے دل کو نہ خطر ہے
طوفانِ تلاطم ہے سمندر کی لہر ہے
یا شاہِ نجف اس کی طرف ایک نظر دیکھ
گر مست ہے دیوانۂ شمشیر و تبر ہے
قندیل جواہر کی جو ہیں ایسی ہی روشن
خورشید قیامت کا وہاں شمعِ سحر ہے
بے گرمیٔ دل پختہ نہ ہو فکرِ یقیں ہے
جو حرف کہ شیریں نہیں وہ خام ثمر ہے
دنداں کا ترے شور، مگر بحر تلک ہے
سینہ میں صدف ہے نہ صدف بیچ گہر ہے

(۱۱۵)

چمن میں غنچہ دہن گر دو چار ہو جاوے
نظر میں بلبلوں کی غنچہ خار ہو جاوے
کمندِ زلف سوں کب آہوئے ختن جاوے
ہما جو اوج پہ دیکھے وہیں شکار ہو جاوے
جو چشمِ مست کو ساقی کی باغ میں دیکھے
سیاہ مستیٔ نرگس خمار ہو جاوے

(۱۱۶)

ضرر ہے صاحبِ حیرت کے تئیں بہت تدبیر
کہ آب سوں گلِ تصویر پر خزاں ہو جائے

(۱۱۷)

یا علیؑ یارِ دل نواز آوے
صید کو دل کے شاہباز آوے

(۱۱۸)

چمن میں قد سوں تری سروِ بوستاں گر جائے
یہ سرو کیا ہے بلا، نخلِ آسماں گر جائے
نگہ کے تیر کا اس کی نشانہ کو نہ ہوئے
کہ ہاتھ رستمِ دوراں سے واں کماں گر جائے
کہاں ہے کوہ کو طاقت کہ وہ رہے ثابت
زمیں پہ حسن کے مری آہ آسماں گر جائے
نگہ کی تیر کے ابرو کماں کی گر دیکھے
فلک کے ہاتھ سوں واں تیغ کہکشاں گر جائے
چمن موں دیکھے جو اس قامتِ بہار کے تئیں
زمیں پہ سایہ صفت سروِ بوستاں گر جائے

نسیمِ عشق سوں پروردہ اس قدر ہوں میں — کبھی جو پاوے ہمائے استخواں گرجائے
مری یہ گریہ سوں بہ جاوے نخل ہاموں کے — کمند آہ سوں یہ نخلِ آسماں گرجائے
میں اُس کی نرگسِ جادو سے ایسا ہوں بیتاب — جگر سوں اُٹھے وہیں آہِ ناتواں گرجائے

(۱۱۹)

جو دیکھے قد کو تری سروِ بوستاں جل جائے — شرارِ نالۂ قمری سے آشیاں جل جائے
بیانِ سوز سوں جیوں شمع یہ زباں جل جائے — زباں تو کیا ہے کہ اک دم میں استخواں جل جائے
بیاں میں کیونکہ کروں آہ سوزِ داغِ جگر — مثال شمع کی دم لینے سوں زباں جل جائے
اگر بلند ہوئے آہ سوزناک مری — مثالِ خیمہ کی اک دم میں آشیاں جل جائے
بدن موں جس کی تپِ عشق کی لہر پہنچے — مثال پنبہ کی اک دم میں استخواں جل جائے

(۱۲۰)

فسردہ دل جو ہوئے اس کو کیا ہوئے حاصل — کہیں درخت سہی سایہ برگ و بر لائے
جو قافلہ کہ محبت کے بادیہ موں گیا — کہاں ہے ایک جواب اس کی کچھ خبر لائے
کنارِ بحر میں بیٹھا ہے کیا اگر غوّاص — نہ کھاوے غوطہ تو کب ہاتھ میں گہر لائے

(۱۲۱)

آہ کو سن کے مری نخلِ بیاباں گرجائے — دیکھ اُس قد کے تئیں سروِ گلستاں گرجائے
لبِ لعل اُس کے پُراز موجِ تبسّم گرجائے — شور سنتے ہی وہاں آہ بدخشاں گرجائے
شور سُن اُس لبِ جاں بخش کا کچھ دُور نہیں — آبِ حیواں موں اگر خضر بیاباں گرجائے
گر نقاب اس رُخِ روشن سوں کبھی اُٹھ جاوے — بامِ گردوں سے خجل ہو مہِ تاباں گرجائے
آب و تاب اس کے لبِ لعل کا ایسا ہے کہ اب — رشک سوں خاتمِ انگشتِ سلیماں گرجائے

---

(۱۲۲)

جس موں کہ بابِ عشق سے اک حرف بھی نہ ہو
اے شیخ وہ کتاب نہیں ہے گی خشت ہے
جو ہے فراقِ یار میں اُسے گلشن ہے خارزار
گر یار سامنے ہو جہنم بہشت ہے
سر حلقہ کافروں کا برہمن کہاں مجھے
اُس بُت کا دل موں داغ چراغِ کنشت ہے
زاہد کو بزم مستوں میں مستی کہاں ہوئے
کب مے سُوں دھو سکے جو خطِ سرنوشت ہے
کھینچا تمام ماہیِٔ دریا کو مثلِ موج
ہر حلقہ اُس کی زلف کا قلابِ شستت ہے

(۱۲۳)

یہ کاکلِ مشکیں نہ ہوئے سحر کا دام ہے
حلقہ میں آہوئے ختن اُسو رام ہے
اے بادِ صبا مشکِ خطا میں یہ کہاں بُو
جو بوئے دل آویز خطِ غالیہ فام ہے
جو زلفِ سیہ دیکھے وہیں بیٹھے کمر سوں
میدانِ محبت کے مسافر کو یہ شام ہے
بے بخت سیہ کس کے سخن میں ہوئے تاثیر
جو نغمۂ جاں سوز ہے وہ پردۂ شام ہے
یہ ساغر و میناسے و گلشن سوں ہے کچھ کام
اے شیخ مجھے ساقیِ گل رنگ سوں کام ہے
بے داغِ محبت کے سخن تجھ کہاں ہوے
جو حرفِ حلاوت نہ رکھے میوۂ خام ہے
جو مے کہ ہوئے صاف وہی پیتا ہوں اے شیخ
جو آب کہ نیرنگ ہوئے کب وہ حرام ہے
کب مشکِ خطا پہنچے ہے اس زلف کی بو کو
یہ نکہتِ جاں بخش مگر روحِ مشام ہے
کر زیرِ نگیں، لبِ رنگیں ہیں پری سب
تسخیرِ سلیماں کو یہ خطِ نقشِ تمام ہے
اس قد کے تئیں دیکھے کہاں زہرہ قمری ہے
شمشاد کمر باندھ کے خدمت میں غلام ہے

(۱۲۴)

سخن کو سُن کے مرے آہ سنگ دل روئے
مرے یہ جلنے اُوپر شمع ہو خجل روئے

۱۲۵

گر مری آہ دردناک سُنے — گر پڑے عیسیٰؑ آسماں روئے
گر مرے سیلِ اشک کو دیکھے — دشت میں میرِ کارواں روئے
گر مری آہِ آتشیں کو سُنے — باغ جل جاوے باغباں روئے

۱۲۶

رقّتِ دل ہے اس قدر میری — میرے رونے پہ اب قضا روئے

۱۲۷

یا علیؓ یارِ غمگسار آوے — تب تو اس موں بہر قرار آوے

۱۲۸

یا علیؓ یارِ دل پناہ آوے — صبح دم رشکِ مہر و ماہ آوے

۱۲۹

یا علیؓ زندگی ملامت ہے — ہجر میں جینا کیا ندامت ہے
اب کہاں تاب انتظار کی ہے — مجھ پہ اک لحظہ سو قیامت ہے

۱۳۰

لیلیٰ چھپی ہے عکس ہر پردے میں آب کے — پھرتے ہیں عناں گشتہ ہیں محمل حباب کے

۱۳۱

کبھی خطا نہ کرے تیر گر کماں پہ ہے — زمیں پہ کیوں نہ ستم ہو جو آسماں پہ ہے

مثنوی

حضرت شاہ کمال علی کمالؔ دیوروی رح

الٰہی تو ہے مطلب تو ہے بُرہان / تری ادراک میں عالم ہے حیران
تری ادراک پر کو لاوے حجت / کہ عاجز ہیں یہاں سب اہلِ حکمت
جو مطلب ہو جلی حجت خفی ہو / تو باطل ہے وہ حجت خوب سمجھو
تو ہے ظاہر تو ہے مظہر جہاں کا / تو ہی موجد ہے بیشک جسم و جاں کا
تجھے ظاہر کوئی کر سکتا ہے آہ / مگر تو آپ ظاہر ہو مرے شاہ
یہ سُرخی ہے اثبات واجب کا باغ / گل اور عندلیبوں کا دل داغ داغ
غرض اس کا اثبات ممکن کہاں / دلیل اپنی خود آپ ہے بیگماں
سمجھ جاؤ مفہوم واجب سے تم / حکیموں کا یاں ہوش ہوتا ہے گم
سمجھ جا گا جو اہلِ انصاف ہے / کرے وجد اس پر جو دل صاف ہے
فقیروں کا جب سے ہوا خاک پا / مرے دل سے حجت کا رتبہ اُٹھا
دلیل اس کی پھر واجب کا مفہوم / کہ واجب ممتنع ہو کر ہو معدوم
اگر معدوم واجب ہو سبب سو / تو معلوم ہو گا بیشک یہ سمجھ لو
اگر معدوم خود ہو بے سبب حق / کہیں گے ممتنع دانا و احمق
عدم واجب کا گر موجب عدم ہو / وجود حق کے تئیں معلول سمجھو
عدم واجب کا باعث وجود ہو / تو واجب ہو گیا معلول سمجھو
عدم واں ہو سبب یعنی عدم کا / کہ ہستی ہو سبب ہستی کا اوس جا

ضروری گر عدم مانع کا ہو گا — تو ممکن کب ہووے مانع سمجھ جا

جو ممکن مانع ہو موجود کب ہو — تخلف لازم آوے خوب سمجھو

وجود اس کا اگر چاہے عدم کو — عدم کا سلسلہ پس گزرے حد سو

غرض مانع اگر لا انتہا ہو — تو واجب بے عدد ہو گا یہ سمجھو

اگر واجب سبھی معدوم ہوں یار — تو سب موجود ہو جاویں گے اک بار

سبب یہ ہے عدم سب کا ہے معلوم — تو پس مانع ہر اک کا ہو گا معدوم

اگر موجود بعضے بعضے معدوم — تو مطلب ہو ہے سب دانا کا معلوم

یہ سرخی تو ہے اور تحریر کے — شگفتہ ہووے باغ تقریر کے

توقف ذات گر ہو کسی پر — تو کب ہستی کو کافی ہو ہنرور

اگر کافی نہ ہو واجب کہاں ہو — جو ہو واجب نہ ہو بالذات سمجھو

سمجھ جاوے گا جو اہلِ کمال ہے — کہ بالغیر ہونا واجب کا محال ہے

اگر بالغیر واجب ہوا دانا — تعدد علت تامہ کا ہو گا

توقف گو عدم پر ہو محال ہے — کہاں سمجھے گا جو اہل کمال ہے

اگر مجموعۂ ذات اور عدم لو — تو واجب کب رہے واجب سمجھ تو

جو سابق ہو عدم بے شک قدیم ہے — تو پس حادث کہاں ربّ کریم ہے

عدم لاحق اگر ہو دور عیاں ہے — جو ممکن ہو غنی ممکن کہاں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٰہی حمد تیری کب بیاں ہو — اگرچہ مو بمو تن پر زباں ہو
الٰہی شعلہ کر خاکِ سیہ کو — گرا اُس کاہ پر برقِ نگہہ کو
الٰہی قفل دل ہے زنگ بستہ — کلیدِ قفل سے کر دے شکستہ
الٰہی ملکے برق ہو جاوے یہ کاہ — دلے کچھ مُردہ خاکستر نہ ہو آہ
الٰہی دل کو نازک اِس قدر کر — کہ موجِ بوئے گل ہو تیغ اُس پر
الٰہی غم سے دل بے تاب کر دے — گدازِ عشق سے سیماب کر دے
الٰہی اس کے نامہ کو اثر بخش — یہ خاکِ سوختہ کو اِک شرر بخش
الٰہی کون ہمرہ تجھ سوا ہو — تو ہی اس بادیہ میں رہنما ہو
الٰہی رحم کر اس خستہ دل پر — بہا سیلِ کرم اس مُشتِ گل پر
الٰہی اشک کو میری اثر بخش — یہ طفلِ خستہ کو یعنی جگر بخش
الٰہی ہجر سے ہوں سخت رنجور — جگر پر خوں ہے دل ناسور ناسور
الٰہی معرفت اپنی عطا کر — الٰہی یہ میری حاجت روا کر
الٰہی غرق ہوتا ہوں میں دم میں — بہا جاتا ہوں سیلابِ الم میں
تلاطم میں پڑی ہے کشتیٔ دل — مگر موجِ کرم پہنچا دے ساحل
مجھے تو رنگ میں اپنے ڈوبا دے — کلام اپنے سے کچھ مجھ کو سُنا دے
جہاں کے لوح سے دھو دے مرا نام — رہے دل پر مرے نقشیں ترا نام
دل اس کا ٹوٹ جا آرہ جگر سے — کہ جیوں جھڑ جاوے گل بادِ سحر سے
غذائے عشق کر اس ناتواں کو — ہُما لے جاوے میری استخواں کو
گریباں چاک ہو دستِ جنوں سے — مثالِ گل ہو رنگیں جامہ خوں سے
میں غرق بحرِ خوں بے تیغ قاتل — میں مثلِ ماہی ہوں طفلی سے بسمل

کہاں تک پہنچوں میرِ کارواں کو
نہ دیکھوں جادہ نہ سنگِ نشاں کو

یہ مژگاں اشکِ خونیں سے بھری ہے
شرر جھڑتے ہیں گویا پھلجھڑی ہے

یہ قطرہ دل کا بحرِ بیکراں ہو
نفس چوں موجِ بحرِ عنبر فشاں ہو

دمِ اعجاز دے تیغِ زباں کو
اثر دے جاں فدائی کا بیاں کو

سیاہی صفحہ کی ہو برق بیتاب
قلم فولاد کا جیوں موم ہو آب

پلا پیری میں ساقی جامِ توحید
کہ شبنم صبح کو ہو جاہے خورشید

اگرچہ غرقِ دریائے گنہ ہوں
یہ صرفِ گریہ جیوں ابرِ سیہ ہوں

جگر کے ٹکڑے جیوں گل ہیں دہن میں
نہ میں بلبل کہ نالاں ہوں چمن میں

غریقِ بحرِ غم ہوں مثلِ ماہی
نہ ہو کیوں صبر کی کشتی تباہی

اڑوں کس طرح میں نہ بال نہ پر
کہاں دام اور کہاں صیّاد کا گھر

کمال اے شبنمِ گلزارِ خورشید
پیا صبحِ ازل سے جامِ توحید

دوئی کے دشت سے سیل ہو گزر کر
لبِ دریائے وحدت پر گزر کر

یہ سرخی ہے توحید کی بوجھ لو
مگر پہلے خوں اپنے ہاتھ سے دھو

سمجھ اس کو کہتے ہیں توحید کے
کہ عاقل ہووے دادِ تجرید کے

کہاں ذہن پہنچے گا توحید تک
یہ کثرت لے آوے گی ہر لحظہ شک

ولایت کا گر نور پہنچے وہاں
قوی ہووے اس نور سے نورِ جاں

نظر آوے تب نورِ باطن تمام
ہوئی صبحِ توحید کثرت کی شام

اگر چمکے واں نور توحید کا
تو ذرّہ ہووے داغ خورشید کا

نہ ہو منکر اس نور کا اے عزیز
اسی نور سے نور کو ہے تمیز

غرض لغزشِ پا کا ہے یہ مقام
اسے کفر کہتے ہیں علمائے عام

خصوصاً امامیہ مذہب میں آہ
اسے کفر کہتے ہیں بے اشتباہ

یہ سمجھا کہ شرع اس سے باطل ہووے
نہ سمجھا کہ ایمان کامل ہووے

فصوص الحکم کو جلاتے سبھی
اگر کفر کے بو کو پاتے کبھی

یہاں کچھ تو انصاف کر اے بزرگ
نہ ہو دوست کے حق میں تو شیر و گرگ

تامل کر اس جا نہ ہو خشم ناک
نہ کر جیبِ انصاف بیہودہ چاک

غرض یہ کہ حفظِ مراتب ضرور
نہ ہو یہ اگر کفر سے کب ہے دُور

اگر ایک نوع ہو یہاں اتحاد
قباحت نہیں کچھ بھی رکھ اس کو یاد

میں یہ رحم کر طالبوں پر کمال
کہوں ہوں کہ لاوے کہیں وجد و حال

کمال اے بے خبر صبحِ ازل سے
سراسر بے خبر علم اور عمل سے

تو اس کے نام کو کر تاجِ توحید
کہ جس کی باغ کا شبنم ہے خورشید

چھپانا حق کا یہ باطل خیال ہے
سمجھنا بے خرد کا گو محال ہے

مگر دانا کہاں بے حجت اے یار
کسی مسئلہ کا کرتا ہے وہ انکار

صدف میں بحر کے روشن گہر ہے
جو دل میں سنگِ خارا کے شرر ہے

جسے دیکھو وہی برہانِ حق ہے
جو کچھ موجود ہے وہ شانِ حق ہے

وہی ہے جس طرف دیکھو وہی ہے
گیاہ اور برق میں سمجھو وہی ہے

مشبہ ہے وہی، جو تھا منزہ
کہاں تک سمجھے گا وہ جو ہے ابلہ

وہ اب تک اوج پر اطلاق کے ہے
مقید کو کہاں واں راہ ہے ہے

ہنوز ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا وہ
نہ سمجھو کے کہ کچھ اور ہو گیا وہ

وجود ایک ہے اگر موجود دو ہے
سمجھ کثرت میں اور وحدت میں کو ہے

حقیقت سب کی وہ عالی جناب ہے
جدا اک آب دریا سے حباب ہے

بدیہی ہے یہ مسئلہ سب کو معلوم
جو واجب ہو عدم ممکن ہو معدوم

اگر موجود ہے واجب ہو ممکن،
تو واجب ہو گیا وہ تھا جو ممکن

عدم گر مقتضائے اک عدم ہو
تو موجود اتحاد ہو اس کو بوجھو

دوئی میں کب عدم چاہے عدم کو
حجر کی نفی کب نفیِ شجر ہو

اگر واجب کو ممکن سے نہ ربط ہے
کئی مسئلہ یہاں حکمت کا خبط ہے

سمجھ توحید کیا علم دقیق ہے
نہ پہنچے اس کو گو فکرِ عمیق ہے

کوئی کہتا ہے کلّی ہے گی وہ ذات — اسے تمثیل سے کرتے ہیں اثبات
نہ سمجھا یہ کہ باطل ہووے تنزیہہ — رہے ہے اس سخن پر حرف تشبیہ
منزّل گر میں کہتا ہوں سخن کو — اگر منصف ہو اس کو خوب سمجھو
گر واجب ہو محتاجِ نحو خود — تو واجب کب رہے واجب سمجھ تو
سبب یہ ہے کہ عام اے صاحبِ ہوش — کہاں موجود بے خاص ہو نہ کر جوش
علاوہ یہ کہ لازم آوے ہے دَور — کہ حاجت دونوں جانب سے ہے کر غور
یہ خاص البتّہ ممکن ہوگا سمجھو — وگرنہ کثرت واجب ہوگا۔ تو جو
کوئی کہتا ہے جُزّی ہے مگر ذات — محیط کل کہاں باطل ہے یہ بات
یہ سمجھا اس نے کلّی ہووے واجب — خرد کو وہم کی ظلمت ہے حاجب
یہی کہتے ہیں سب اہلِ وراثت — مقیّت حق کے ہے اور ہے معیّت
معیّت وہ نہیں جس سے ہو کلّی — محیط ہونے سے سمجھا اُس کو کلّی
تعیّن کا نہیں ہے قید اس کو — کہیں ہیں اس کو مطلق اس سبب سو
وہ کلّی ہے جو کثرت پر ہے محمول — احاطت اور ہے حمل اور مقبول
مناطِ حمل گرچہ اتّحاد ہے — نہ علّت تامّہ حمل ہے یہ یاد رہے
اگر بالفرض علّت تامّہ جانو — تو یہ اور اتّحاد ہے اس کو مانو
مگر مجہول کُن یہ اتّحاد ہے — یقین جانو کلام اُوستاد ہے
اگر موجود دو ہوتا اے دانا — تو واجب کلّی ہو جاتا سمجھ جا
مگر موجود دو ممکن کہاں ہے — اسی واحد کا جلوہ ہے جہاں ہے
تکثّر وہمی ہے اور اعتباری — کہاں ہو ذاتِ واجب تک وہ ساری
حباب و آب کی ہستی نہیں دو — مگر ممکن کہاں یہاں حمل سمجھو
شجر ہوتا ہے تخم اور جڑ نمو گر — بر آوے شاخ و برگ و گل برابر
ظہور اُس کا کسی انواع میں ہو — کوئی کہتا ہے تخم ہے نخل سمجھو
یقین کے سبب جو ہووے جزّی — وہ کثرت کے سبب تعیّن سے ہو کلّی

ولیکن وہاں یقین عین ذات ہے
جو ہے عین اگر اسماء صفات ہے

اگر توحید اعیانی نہ بوجھو
تو یہ توحید علمی خوب سمجھو

جسے واحد نظر میں دو جہاں ہے
اُسے توحید اعیانی عیاں ہے

جسے توحید کا علمِ یقیں ہے
اُوسے توحید علمی دل نشیں ہے

جو اس توحید علمی کا ہے انکار
اُوسے شرکِ خفی ہے دل میں اے یار

جو اس توحیدِ علمی سے ہے غافل
اُوسے کہتے ہیں مشرک اور جاہل

ولے توحید اس دوری کا یہ ہے
چراغِ غول جن کا شمع رہ ہے

کہ دشمن عاشقوں کا بے سبب ہو
اگر تقصیر ہو تو کیا غضب ہو

نہ توحید ہے کہ طالب کا ہو رہزن
گرا دے چاہ میں لاکر کئی فن

نہ توحید ہے بچھا کر دام تزویر
کرے بیچارہ سادہ دل کو تسخیر

نہ توحید ہے کہ خطبہ اپنا پڑھنا
بُتِ اندیشۂ باطل کو گڑھنا

کلامِ حق سے چاہے کوئی فاضل
کرے توحید بے تاویل باطل

کہاں ممکن ہے گو فاضل ہو تحریر
ہزاروں دیکھا ہو گر اوس نے تفسیر

ماوّل سمجھا ہے اکثر نے مجمل
کہاں تک میں کہوں تجھ سے مفصّل

اگر تاویل باطل حق ہے توحید
کہ فیکم بس ہے سمجھو اہلِ تحریر

مجاز اور رمز سے حسنِ کلام ہے
کہ ذہنِ خاص کو جودت تمام ہے

نزولِ وحی حسب فہم عام ہے
معانی میں بیاں اس کا تمام ہے

اگر متکلّمیوں نے نہ سمجھا
جو ربط ہے حق کو ممکن سے عجب کیا

و حق جانو خدا نے جو کہا ہے
وگرنہ ثمّ وجہ اللہ کیا ہے

خبر کہتے ہیں جس کے انبیاء سب
بیاں کرتے ہیں جس کا اولیاء سب

کہو منکر کا اس کے کیا لقب ہے
اگر کافر نہیں حیرت عجب ہے

سُنا ہے مرشدِ کامل سے یہ بات
کرے ہے نفی اُس کو کفر اثبات

فلاطونِ الٰہی خم نشیں تھا
حکیمِ صاحبِ عین الیقیں تھا

نہ تھا توحید اعیانی سے آگاہ
مگر توحید علمی سے ہو کچھ راہ
نہ کشفِ سرّی و روحی تھا حاصل
نہ ہو گو کشفِ قلبی سے وہ غافل
جو کوئی میدان جانبازی کے ہیں مرد
اُسے کہتے ہیں طفلِ مکتب درد
ارسطو فیلسوفِ اوّلیں تھا
حکیم صاحبِ ذہنِ متیں تھا
فلاطونِ الٰہی کو وہ کہتا
کہ اس کو مرض مالیخولیا تھا
غرض وہ قدوۂ مشائیاں تھا
ولے توحید سے آگہ کہاں تھا
اگر اک ذرّہ ہو انکارِ توحید
کہاں طالع ہو واں ایماں کا خورشید
خلافِ شرعِ ظاہر گو ہو توحید
مگر قرآں میں کئی آیت ہیں تائید
مجرّد کے معیّت کب تماس ہے
سمجھتا ہو گا وہ جو حق شناس ہے
مماس ہو جسم کو گر جسم اے جان
تلوث خاصۂ جسم ہے اسے مان
غرض جس جسم کو فرسودگی ہے
اسی کے ملنے سے آسودگی ہے
اگرچہ نورِ مہر و مہ لطیف ہے
محیط ہے سب کو گو جسم کثیف ہے
کہ نسبت ہے مجرّد کے برابر
سبھی اجسام کی جانب برادر
مگر توحید حکایت سے بری ہے
حکایت کیا اشارت سے بری ہے
محیط و قطرہ ہیں ہم شکل دیکھو
کل و جزو ربط کیا رکھتے ہیں سمجھو
نہ کر توحید کے انکار کی بات
کیا برہانِ عقلی سے ہیں اثبات
یہ سرخی لواحق کے توحید کے
یہ گلدستہ ہے باغ خورشید کے
غرض زندہ جانو جمادات کو
کہ جاں کا اثر ہے نباتات کو
بدن میں سب کے ہے روحِ الٰہی
اگر بدن ہے برق یا ہے سیاہی
مگر دریائے اعظم کو بھی جان ہے
وگرنہ جزر و مد کیا بیان ہے
غرض دو بار دم لیتا ہے دریا
تمامی روز و شب میں اب سمجھ جا
کبھی چھوڑے ہے اور کھینچے ہے دم سے
جوار اور بھاٹا ایما ہے اسی سے
کہاں موّاج ہو دریائے عمّان
نہ ہو گر باد تند اے نکتہ فہمان

یہ دم لینا نہیں طوفاں ہے سمجھو
یہ نالہ بھرتا ہے شورش سے بوجھو

لبِ دریا پہ کوئی مہرِ گرداب
ولیکن شورشِ دل سے ہے بیتاب

مگر اس گرد کے تن میں بھی ہے جاں
کہ ذرّہ مہر کے آگے ہے رقصاں

اگر زندہ نہ ہو ذاکر کہاں ہو
عناصر یا زمیں یا آسماں ہو

بیاں تنزیل میں ہے سب کے تسبیح
زیادہ اس سے کیا ہوتی ہے توضیح

مگر سورج مکھی نخلِ عجب ہے
کہ برگ و شاخ و گل جنبش میں سب ہے

سبب کیا ہے جو مرجاوے ہے شب کو
مگر بے مہریِ مہری ہے سمجھو

پھرے ہے جس طرف خورشید ہو ہے
محبّت کی مگر تائید ہو ہے

محبّت سر بسر اعجاز سمجھو
محبّت کو خدا کا راز سمجھو

محبّت سے ہوا آئینہ آدم
جلا بخشا جو روح اپنی کیا دم

محبّت قصۂ مشکل سناوے
سلیماں مور کے در پر لے جاوے

محبّت سے فلک رقصاں ہے دائم
محبّت سے زمیں دریا پہ قائم

محبّت مظہرِ سرِّ خدا ہے
ہمائے اوجِ عرشِ کبریا ہے

محبّت مور کو کر دے سلیماں
گدا اور شاہ کو کر دیوے یکساں

محبّت سے گنہ ہو جاوے طاعت
اسی سے سرکشی ہووے اطاعت

محبّت برق کر دیوے ہے خس کو
ہما کے اوج پر لے جاوے مگس کو

محبّت جذبہ سے دل رام ہو جائے
اگر عنقا ہے صیدِ دام ہو جائے

محبّت روح بخشِ مشتِ گل ہے
محبّت فتحِ بابِ بام دل ہے

محبّت صاف و روشن سینہ کر دے
حرارت سنگ کو آئینہ کر دے

محبّت گر نہیں افسردگی ہے
کہاں ہے زندگی، دل مردگی ہے

یہ سرخیِ اثباتِ رویت سمجھ
جگر خوں نہ کر اے اہلِ حکمت سمجھ

بدن سے ضعیف ہووے کیا نورِ جاں
نہ دیکھے گا نورِ قوی بے گماں

وگرنہ خدا کو کہاں ہے نقاب
مگر شدّتِ نورواں ہے حجاب

خدا کو نہ سمجھیں ہیں عاجز عجب
نہ ہو تُو کبھی اِس قدر بے ادب

قیاس اپنے اوپر کریں ہیں سبھی
نبی اور ولی کوں مگر ہیں کبھی

تعلّق سے برزخ یہ کیا کچھ ہوا
وہ خفّاش ہے آپ خورشید تھا

وگرنہ یہ جاں نورِ روحانی ہے
نہ ذو حجم، نہ جسم جسمانی ہے

غرض شغلِ جسمانی مانع ہوا
تُو اِس تیرہ برزخ پہ قانع ہوا

پڑا روح میں عکسِ ظلماتِ تن
اسی سے حجاب ہوگیا یہ بدن

اگرچہ مقر اِس کے ہیں اشعری
مگر ہوتے ہیں دشمنِ حیدری

پس اقرار کا ان کو کیا سود ہے
قیامت میں کب ان کو بہبود ہے

یہ لغزش کی جا ہے قدم کے کمال
غنیمت سمجھ جو کہ ہے قیل و قال

اسے کہتے ہیں معرکے کا مقام
کہ صبحِ قیامت ہے یاں تیرہ شام

خرد کہتے ہیں ممکن کوں کہاں راہ
جنابِ حضرتِ واجب تلک آہ

کہاں یہ بندۂ خاکی کہاں حق
وہاں باطل کہاں پہنچے جہاں حق

کسے ہے عشق لیکن عاشقوں سے
نہ ہو نومید حق کے آستاں سے

تقدّس اس کا گو لا انتہا ہے
جناب اس کا جنابِ کبریا ہے

مگر بخشائش اُس کی بے سبب ہے
خرد کو اس سبب سے تاب و تب ہے

عطائے بے عوض حق کی صفت ہے
یقیں ہے جُودِ فیضِ بے جہت ہے

اِسی باعث کہے ہیں حق کو جوّاد
نہ ہو نومید تو خاطر کو رکھ شاد

تعلّق کب ہے بخشش کو عمل سے
کہ انساں پر نوازش ہے ازل سے

اگر رویت محال ہوا ے نکو خُو
طلب اوس کے ہو ممکن کب نبی ہو

طرف غیروں کے کب نسبت طلب کی
صحیح ہے ربِّ ارنی سے سمجھ ہی

سُنو تم اک دقیقہ اے کہ و مہ
کہ عارف مَنْ یرّا فیہ ہے بعینہ

محال ہے دیکھنا بندے کو حق کا
نہ حق کو دیکھنا اپنا سمجھ جا

اگر رویت محال ہوتی سراسر
نہ کہتا لن ترانی اے برادر

کہ دکھلانے کی قدرت سمجھے جا ہے
اسے طاقت کہاں جو دیکھے ہے

جو اس کو بخشے استعداد کیا دُور
تجلّی دیکھا موسیٰ نے، جَلا طُور

نہ ہو ابطال پر جس کی دلایل
اُسے چھوڑیں ہیں امکاں بیچ عاقل

یقیں ہو جس کو بے بُرہاں کسی کا
وہ بے شک رتبہ سے انساں کے نکلا

لکھا ہے ابن سینا نے شفا بیچ
سخن ہے راست کیا اس میں کج و پیچ

کہاں عاجز ہے دکھلانے سے اپنے
دکھاتا ہے عیاں عاشق کو اپنے

نہ ہو ملحد نہ کر رویت کا انکار
نہ کر تاویلِ آیات، اے مرے یار

نظر معنی کی جس جا انتظار ہو
وہاں ناظر کو رنج بے شمار ہو

و لیکن رنج کی جا کب ہے جنّت
کہ اُس کو کہتے ہیں دار السّلامت

یہ سمجھا کوں ہے محسوس بالذات
کہاں محسوس سوں اور حق یہی بات

نہ سمجھا نور ہے محسوس اوّل
اسے کر سکتے ہیں عاقل مدلّل

کہ ظاہر ہے وساطت نور ہے نور
و لیکن کون بے نور ہو ہے مستور

نہ ہو گر نور ظاہر پیشِ دانا
تسلسل یا کہ دو ہووے سمجھ جا

اگر ہے شرط رویت سوں اے یار
تو یہ ہے چشم ظاہر بیچ اشیار

اگر اس حسنِ ظاہر کے سوا ہو
کئی حسّ تیز و روشن اس سے کیا ہو

نہ کچھ بطلان پر اس کی دلیل ہے
نہ مستبعد، صریح و مستحیل ہے

نہ ہو گر روحِ انساں کی منوّر
تو کب ظاہر ہووے کچھ اس کے اوپر

نہ ہو گر آپ پر ظاہر کوئی شئے
تو کب ظاہر کوئی شے اُس پہ ہووے

مجرّد کو نہ کر اے صاحبِ ہوش
قیاس اس جسم پر خاموش خاموش

ہوا شرط ہے صدا کی اِس جہاں کو
نہ شرطِ صوت ہے یہ آسماں میں

کہیں ہیں یہ سخن سالک وہاں کے
کہ سُنتے ہیں صدا کو آسماں کے

لطیف ہے اس سبب یہ روح آدم
کہ بے ریب اس کو جان عین آدم

کرے جس کا تصوّر اس کا عین ہو
یہ تحقیق حکیم ہے اس کو سمجھو

بیاں ہے فلسفہ اولیٰ میں معقول ۔ کہ ایک ہے عقل اور عاقل و معقول
سمجھ یہ قوت وہمیہ کیا ہے ۔ مگر آئینۂ قدرت نما ہے
اسی قدرت ہے ایجاد جہاں کی ۔ کلید ہے قفلِ گنجِ کن فکاں کی
اگر رویت محال ہوتی اے دانا ۔ تو کب بر آتی عاشق کی تمنّا
ابد تک آتشِ حسرت میں جلتا ۔ مثالِ شمعِ موم ہر لحظہ گلتا
بعید ہے رحمتِ رحماں سے سمجھو ۔ خصوصاً رحم بے پایاں سے بوجھو
نہ پہنچے آتشِ حسرت کو دوزخ ۔ مثالِ شعلہ کانپے اس سے دوزخ
کہ دوزخ آگ جسمانی ہے بوجھو ۔ یہ حسرت نارِ روحانی ہے سمجھو
جسے ہستی عذاب دائمی ہو ۔ اُسے ایجاد کب کرنا ہے سمجھو
نہ عاشق ہونا حق پر مستحیل ہے ۔ نہ کچھ بطلان پر اس کی دلیل ہے
جو عاشق ہے وہ ہے دیوانہ اُس پر ۔ جہاں وہ شمع پر پروانہ اُس پر
اگر کہنا مرا باور نہیں ہو ۔ کہو جا کر کسی عارف سے رُو رُو
کہ شاید گریہ او پر رحم آوے ۔ کبھی نورِ ولایت کو دکھاوے
یہی کہتے ہیں سب اہلِ نہایت ۔ سبب ہے کشف کا نورِ ولایت
مگر یہ نورِ اشراق جنوں ہے ۔ کہ منکر اوس کی عقل ذوفنوں ہے
اگرچہ عقل بحرِ بیکراں ہے ۔ اسے اس نور سے نسبت کہاں ہے
اگرچہ وہم سلطانِ حواس ہے ۔ ولے درکِ خرد سے اس کو یاس ہے
اگر نورِ بصر دکھلاوے ناسوت ۔ یہ وہ نور ہے کہ پہنچاوے ہے لاہوت
عبث منکر ہے تو اس نور کا شیخ ۔ رکھے ہے کچھ بھی تو خوفِ خدا شیخ
جہاں میں اہلِ عرفاں ہیں یقیں جان ۔ عدوِّ حق نہ ہو کہنا مرا مان
کلامِ صوفیاں ہے رمز سے یار ۔ نہ کر تو بے تامّل اس کا انکار
جو کچھ حدّت ہے اس نورِ نظر کو ۔ کہاں اس کی خبر ہے بے بصر کو
پہنچ جاوے پلک میں آسماں تک ۔ ہزاروں سال کی راہ ہے وہاں تک

اگر یہ نورِ روح ہے تو عجب کیا
دو عالم سے پلک میں گر گذر جا

اگر عرفاں سے جو ہو جا گا مایوس
قیامت تک ملے گا دستِ افسوس

قسم خالق کی عارف ہیں جہاں میں
طلب گر ہو تو پاؤ ہر مکاں میں

طلب اس راہ میں شرط ہے اے دانا
جو طالب ہو کبھی تک وہ پہنچ جا

جو بیٹھے اس کے در پہ حلقہ زن ہو
بہاوے سیلِ خوں چشموں سے دو رو

کریم آکر کرے مرہم فشانی
اسے حاصل ہو عمرِ جاودانی

درِ حق کیا ہے سمجھو ہے درِ دل
یہاں سے سب کی حل ہوتی ہے مشکل

کلیدِ قفلِ در کیا ہے سمجھ تو
نگاہِ لطفِ صاحبدل ہے بوجھو

سخن مرشد کا ہے صورِ سرافیل
قیامت لاوے ہے بے قال و بے قیل

اُڑے جیوں پنبہ دم میں کوہِ ہستی
نہ مخموری رہے باقی نہ مستی

کمالؔ اے سیلِ کوہستانِ وحشت
جگر پُرسوز طوفانِ محبت

لبوں پہ ٹھہر کر گر جاں عزیز ہے
کسے باطل سے اب حق کی تمیز ہے

وہ کیا شور ہے عبث تو کیا جرس ہے
سخن اس راہ میں اتنا ہی بس ہے

کوئی سنتا ہے کب تیرے سخن کو
نہ کھول ہرزہ کبھی اپنے دہن کو

سخن تیرا اگرچہ شمعِ رہ ہو
جو مقدور ہو کریں خاموش اس کو

تو جلدی چل کہ منزل دور ہے آہ
تیرے کہنے سے چلتا ہے کوئی راہ

یہ ہے سرخیٔ عشقِ دریائے خوں
سفینہ کا یاں ناخدا ہے جنوں

بیاں عشق کا اس زباں سوں کہاں
مگر عشق اپنا کہے داستاں

امانت ہے رمزِ عشق سے بے گماں
ڈرے اس سے کوہ اور زمین آسماں

اسی عشق سے ہو ہے ممکن محال
اسی عشق سے دیکھو حق کا جمال

عطارد سے کاتب سے کب ہو رقم
گرے ہاتھ سے کاتب لوح و قلم

کمالؔ اے عشق کے خنجر سے بسمل
تڑپ میں وجد کی ہر دم ترا دل

یہی عشق ہے زمیں سے آسماں تک
یہی عشق ہے مکیں سے لامکاں تک

جو کچھ تھا گنجِ مخفی عشق تھا عشق
تمام سرِّ معنی عشق تھا عشق

نہ مہر و ماہ نہ عرشِ بریں تھا
نہ بحر و بر، نہ یہ فرشِ زمیں تھا

نہ جنّت تھی نہ دوزخ تھا نہ اطراف
نہ تھا سیمُرغ، نہ عنقا، و نہ قاف

نہ جوہر نہ عرض تھا نہ محلِ حال
زباں اُس گفتگو سے ہوگئی لال

ہیولیٰ کو نہ قدرت تھی نہ ہستی
نہ شیشہ تھا نہ مَے، لیکن تھی مستی

نہ تھا جب کچھ بھی ممکن عشق تھا عشق
اگر تھا بحرِ ساکن عشق تھا عشق

اِسی دریا نے مارا جوشِ پُر جوش
یہ اُس کی موجیں ہیں خاموش خاموش

اَزل سے اَبد تک عشق ہے عشق
نہایت سب کا بے شک عشق ہے عشق

بلند ہے گو جنابِ حضرتِ عشق
ولے ہستی ہے سب کی نسبتِ عشق

زمیں کو باعثِ حیرت ہے نسبت
فلک کو موجبِ حرکت ہے نسبت

کہاں یہ عالمِ عشق اور کہاں عقل
اگرچہ ہووے بحرِ بیکراں عقل

یقیں جانو کہ جو علم محال ہے
کمالِ عقل تجویزِ احتمال ہے

کہ حاکم عالمِ امکاں پر ہے عقل
نہ حاکم ممتنع پر ہے، یہ ہے اصل

اگر واقع کسی جا ہیں محال ہو
تو آگے عقل کے باطل خیال ہو

ولے عاشق کے آگے کب محال ہے
سبھی ممکن ہے گو باطل خیال ہے

اسی باعث کہیں عاشق کو یکرنگ
خرد حیرت سے یاں ہوجاوے ہے سنگ

نہ کہہ عاشق پہ اے زاہد تبرّا
کہ عاشق خیر و شر سے ہے مبرّا

اگرچہ معصیّت لاانتہا ہو
ضرر کیا ہے اگر عشقِ خدا ہو

کلامِ قدسی اِس پر شاہدِ نیک
نہ کہہ عاشق کو بد اے زاہدِ نیک

اگر عاشق نہیں دل مُردہ ہے وہ
مثالِ برق کے افسردہ ہے وہ

نبوّت یا اقامت کب ہے تجھ کو
کہاں تک پاک ہوگا معصیّت سو

سمجھ یہ شورِ سودا ہر طرف ہے
لبِ دریا بھی دیکھو کف بکف ہے

ہر اک عنصر کو کیوں مرکز کی میل ہے
تو اپنے اصل سے غافل بھی بنے ہے

اگر ہے عشق تو گمراہی کہاں ہے
طلب کی رہ میں میرِ کارواں ہے

اگر ہے عشق غمِ عصیاں کا کیا ہے
کہ تجلی تیرہ شب میں رہنما ہے

گناہ افعی کا سم ہے گرچہ اے دل
فسونِ توبہ ہے تریاقِ کامل

کسی ٹوٹے کی کچھ قیمت کہاں ہے
مگر دل ٹوٹنے پہ بے بہا ہے

کلامِ قدسی اِس اوپر دلیل ہے
صحت اس قول کی بے قال و قیل ہے

کہاں عرفاں سے عاشق ہو ہے محروم
کہاں عاشق مریں عارف کو معلوم

سراسر عشق ہے اے دل غنیمت
اگرچہ وہ مجاز ہو یا حقیقت

یہ روشن سب پہ ہے جیوں صبحِ صادق
کہ عشقِ پاک سے معشوق ہو عاشق

اگر ماہی ہے سینہ خار خار ہے
اگر مہتاب ہے دل داغدار ہے

دلِ سیلاب کو گر اضطراب ہے
گرہ دریا کے سینہ میں حباب ہے

رکھے ہے سیلِ غم سے گر تب و تاب
لبِ دریا پہ ہے بُت خانہ گرداب

اگر بلبل سیہ ہے دُودِ غم سے
دلِ گل شعلہ ہے سوزِ الم سے

جگر کے ٹکڑے ہیں جیوں گل ہیں دھن میں
مگر الماس ہے شبنم چمن میں

نہ شبنم ہے کہ غم سے کھا کے خونناب
گرہ گل کے گلو میں ہو گیا آب

اگر نخلِ فلک سرو ہے برادر
تو مہ قمری ہے اُس کے سر کے اوپر

اگر مینا ہے مے سرو ہی ہے
چو پنبہ سر پہ قمری بھی یہی ہے

غرض جس جا کہ حُسنِ دلربا ہے
وہاں بے پردہ اس کا مُبتلا ہے

جُدا کب بے دلوں سے ہو ہے دلبر
گُلِ خورشید ہے دریا کے اوپر

پلا اک جامِ مے ساقی کرم سے
کہ جس کے جُرعہ سے رقصِ فلک ہے

کماں اے غرقِ سیلِ اشکِ خونیں
پلک جیوں پنجۂ مرجاں ہے رنگیں

کہاں تلک لکھ سکے گا شرحِ غم کو
ہوا ژولیدہ مُو اب خامۂ مُو

سمندِ خار دشتِ آتشیں کو
کہاں طے کر سکے اس کو سمجھ تو

سمندِ ہوش کے اب باگ کو چھوڑ
تو دشتِ مدح کی جانب عناں موڑ

یہ ہے سُرخیِ نعتِ شاہِ رُسل — کہ بے ریب ہیں خواجۂ جزو کل
محال ہے ثنا اُن کی یہ ہے ثنا — ثنا بھی کسی نے اگر کچھ کہا
اشارت سے اُن کی قمر دو ہوا — رسولوں میں اس رُتبہ پر کو ہوا
پلا ساقی مئے روشن کا اک جام — رکھے سر پر گلِ خورشید کو شام
کمال اے عندلیبِ گلشنِ درد — نسیمِ بے خودی تیرا دم سرد
خیالِ غنچہ و گل سینہ سے دھو — نبی کے نعت میں دستاں سرا ہو
دہن کو آبِ کوثر سے صفا کر — خیالِ موجِ شاہِ انبیا کر
کہاں ہے آبِ کوثر کی یہ پاکی — زباں قابل ہووے اس سے ثنا کی
اگرچہ نوح شیخ المرسلیں تھے — محمدؐ رحمۃ للعالمیں تھے
عجب رحمت کہ بحرِ بے کنار ہے — سمجھ وسعت میں ذاتِ کردگار ہے
میان احدیت اور واحدیت — ہوئی وحدت محمدؐ کی حقیقت
اسی سے قابَ قوسین ہے اشارت — بنی ہے یاں سے ہستی کی عمارت
چہل کو پہنچے شاہِ انبیاء جب — بر آیا میم احمد کا عدد تب
فلک سے گزرے شاہِ انبیاء جلد — نگہ عینک سے پار ہو جائے کیا جلد
خراماں دیکھ سجدہ کرتے تھے بگبر — کہ رہتا سر کے اوپر پارۂ ابر
نہ تھا وہ ابر، تھا نورِ الٰہی — لے جا جیوں برقِ ہستی کی سیاہی
کمال اے بادۂ معنی سے سرشار — خیالِ نرگسِ ساقی سے بیمار
قدم آہستہ، میداں مدح کا ہے — مبادا چاہ میں گر جاوے ہے ہے
یہ ہے سُرخیِ مدحِ شیرِ خُدا — دو بندے ہیں واں کے قدر اور قضا
دہن بیچ کس کے ہے ایسی زباں — کمالات واں کے کرے کچھ بیاں
وہاں کی ولایت کی مشکوٰۃ سو — ولایت سبھی پر تو ہے بوجھ تو
شتابی سے پلا اک جام ساقی — رمق اک جاں ہے مخموری سے باقی
ولے دم میں اے جاں مُردہ ہوں میں — دماغ آشفتہ دل افسردہ ہوں میں

ہوا ہوں قصرِ غم میں سخت بیتاب — رہے ہے چاہ میں پیوستہ سیماب
کمالؔ اے نغمہ سنجِ پردۂ درد — نوائے بے خودی تیرا دمِ سرد
علی کی مدح کا قانو بجا دے — تو بزمِ دل کو رونق اور صفا دے
زباں کو کس سخنور کی یہ پا کی — کرے جو مدحِ شاہِ اولیا کی
زبانِ عقلِ کل، قاصر بیاں سے — ادا ہو نعت ان کی کس زباں سے
قضا فرماں نویس اُس شاہ کا ہے — قدر ایک فرد دفتر سے جُدا ہے
گدا ہیں جو کہ شاہِ انمّا کے — کئی قاروں گدا ہیں اُس گدا کے
جھلک صمصام کی دیکھے اگر برق — وہیں دیکھے تن اپنا خون میں غرق
فلک کو خرقہ گو ممکن نہیں ہو — ولے اس تیغ کے جلوے سے ہو
ازل سے تا ابد دُلدل کے یک جست — غزال اُس کی نگہ سے ہو سیہ مست
سُنے گر رعد ادنیٰ شور اُس کا — جگر اُس کا مثالِ برق پھٹ جائے
سرِ سم مارے گر چرخِ بریں پر — گرے سو ٹکڑے ہو کر وہ زمیں پر
نہ پہنچے بال کو جنّت کا سنبل — نہ پہنچے غالیہ سا، گر ہو کاکل
ولایت ختم ہے شاہِ نجف پر — ولیکن اس کے معنی ہیں برادر
ولایت بے وساطت ہے اُنھیں کو — تو باور کر یہ دولت ہے اُنھیں کو
اگر حاصل کسی کو ہے ولایت — تو جا تو یہ وہاں کی ہے عنایت
عجب ہے میر باقر مجلسی کو — کہ دشمن جانتے ہیں دوستوں کو
جو عارف ہیں غلامِ مرتضیٰ ہیں — گواہ اس پر علی موسیٰ رضا ہیں
اگر شک ہو تو جا مشہد کو دیکھو — وہاں جو مقبلاں ہیں اُن سے پوچھو
علی کا فیض جاری تا ابد ہے — یہ وہ دریا نہیں ہے جس کو حد ہے
اگر پاؤ کسی کامل ولی کو — جو چاہو دیکھو واں بے شک علی کو
علی بے شبہ شاہِ اولیاء ہیں — علی بے شبہ فخرِ انبیاء ہیں
میں کب سُنّی ہوں اے قائل ولی کے — کہ مرشد میرے تھے شیعہ علی کے

مگر معنی ہیں اس شیوہ گری کے
کہاں سمجھے کوئی جُز حیدری کے

غرض مُرشد سے مجھ کو یہ ہے ارشاد
کہ عارف قیدِ مذہب سے ہیں آزاد

اگرچہ قیدِ مذہب سے بری ہے
مگر بے شبہ عارف حیدری ہے

کمال اے بے ادب آہستہ رکھ گام
یہ دشتِ مدح ہے کیا ہو سرانجام

کہاں قابل وہاں کے یہ سپاس ہے
یہاں حیرت میں سب وہم و قیاس ہے

ادب کے جادہ سے جاتا ہے تو دُور
یہ صحرا کون ہے اے سیلِ پُرشور

مگر کیا دُور ہے اُن کے کرم سے
قبولیت ہوئی اس کے سخن سے

کمال اے وحشیِ دشتِ محبت
تجھے آوارہ کر دیتی ہے وحشت

کدھر جاتا ہے وحشت کے اثر سے
کوئی چلتا ہے یوں تنہا سفر بھی

نہ یاں اب بدرقہ نہ قافلہ ہے
نہ زاد اس راہ میں نہ راحلہ ہے

جنوں یہ پہنچا فوجِ غم کو لے کر
تو استقبال کو چل گھر سے باہر

یہ سرخی توکل کی ہے عندلیب
گل و گلشن و رنگ و بُو ہے عجیب

توکّل برقِ خرمن ہے ہوس کو
جلا دے دم میں اک عالم کے خس کو

توکّل افسرِ شاہنشہی ہے
کلیدِ بابِ درویشی یہی ہے

توکّل سے ہوئی ہے خاک اکسیر
کرے ہے مفلسوں کو اہلِ توقیر

توکّل صبحِ خورشیدِ یقیں ہے
فروغِ رنگِ باغستانِ دیں ہے

توکّل سے گُہر پہنچے صدف کو
کرے لعلِ یمن سنگ اور خذف کو

توکّل زادِ رہ ہے رہرواں کا
توکّل بدرقہ ہے کارواں کا

توکّل کب رکھے مفلس کو محزوں
جلادے حرص کے ہاموں کے ہاموں

توکّل مایۂ آرام جاں ہے
توکّل نقش بندِ کامِ جاں ہے

توکّل فضل کا اُس کے اثر ہے
کہ یہ اسباب سے قطعِ نظر ہے

توکّل کیا ہے جمعیت ہے دل کو
توکّل روح کر دے مُشتِ گِل کو

توکّل بے نیازی کی ہے شمشیر
گدا کو وہ کرے شاہِ جہاں گیر

توکّل شمع بزم اولیا ہے | فروغِ جلوۂ مہر و وفا ہے
یہ سُرخی رضا اور تسلیم کے | گلِ گلشنِ جاں ہے تو گر سمجھے
جو عارف ہیں وہ شاکر ہیں قضا کے | وطن سمجھیں ہیں مشہد کو رضا کے
رضا نفیِ ارادت ہے اسے جان | گزر خواہش سے یہ کہنا مرا مان
ارادہ عبد اور حق کا جو ایک ہو | تو بندہ قادرِ مطلق ہے سمجھو
مراد ایسی ارادت سے جدا کب | ہووے حکم اُوس کا حکمِ جنتی تب
نہ پہنچے رضا ہرگز جناں کو | کہ رضواں اسم مشتق ہے رضا سو
مگر مشہد رضا کا دیکھ اے جاں | جو ہے داروغۂ فردوس رضواں
جو مشہد کی رضا پر رہ نہ پاوے | مُراد اُس کی اَبد تک بر نہ آوے
جسے ضدِّ رضا حاصل ہوئے یار | وہ عاجز بندہ کب ہووے ہے مختار
جو داروغہ جہنّم کا ہے مالک | تو مکن اُوس کا دوزخ ہے اے سالک
یہ سرخی ہے تسلیم کی باغ دیں | بہار اس کی دیکھیں گے اہلِ یقیں
درمِ تیغ ہے راہ تسلیم کے | شہیدوں سے میں نے یہ تعلیم لی
سمجھ تسلیم نفی، فعل ہے یار | اِسی باعث نہ ہو عارف کو کچھ کار
اگر کچھ کام میں عارف کو دیکھو | تم اس کو فعلِ حق بے شبہ سمجھو
کہاں عارف کا فعل ہے اختیاری | جو واقع اُن سے ہوئے اضطراری
غرض عارف کا سرِ تسلیم تیغ ہے | کہاں جاں اپنے سے اُن کو دریغ ہے
رہ تسلیم ہے شمشیر اے دل | کریں یاں وجد سب پروازِ بسمل
جو سر کو راہ ہاتھ رکھ جا یہ راہ | کہاں قطعِ بوادی ہو سکے آہ
کماں اے شیشہ دل سرشارِ بے مئے | سراپا سوز مثلِ نالۂ نے
ہلِ گردوں کے سایہ میں نہ کر خواب | کہ دم میں آوے گا فتنہ کا سیلاب
نہ ہو غافل تو چرخِ واژگوں سے | میں ڈرتا ہوں یہ پیر ذو فنوں سے
کمالِ کہکشاں کھینچے ہے افلاک | ہدف اس تیر کا یہ تودۂ خاک

شفق کیا ہے کہ ظلمِ آسماں ہے — یہ سیلِ خونِ تیغِ کہکشاں ہے
سحر پیری کا پہنچا ہوش کر ہوش — چراغ زندگی ہے دم میں خاموش
اگر عاقل ہے تو دیوانگی کر — اگر تو شمع ہے پروانگی کر
اُٹھے موجِ جنوں دریائے غم سو — بہا لے جائے مثلِ خس خرد کو
سخن دیوانگاں کا معتبر کیا — بیاں بس کر یہاں خاموش ہو جا
مگر یہ بھی اگر دانا نہ سمجھے — سخن دیوانہ کا دیوانہ سمجھے
تو موجِ نالہ سے کر دُر فشانی — کہ نیساں کا سحاب ہو جاوے پانی
یہ ہے سرخی فصلِ گل عندلیب — نسیمِ چمن کی بھی رنگیں ہے جیب
عجب کیا جو ساقی کرے سیرِ باغ — نگہ سو کرے گل کو مے کا ایاغ
چمن میں اب کی نیرنگی عجب ہے — صبا سے پوچھ بلبل کیا سبب ہے
بہار اس شان سے آئی کہاں تھی — کہ رنگیں ہے چمن کی خاکِ در بھی
بہار آئی ہے کس شوکت سے امسال — بنفشہ پر ہوا سنبل چنور ڈھال
سماتا ہی نہیں گل پیرہن میں — یہ کس کی بو صبا لائی چمن میں
یہ کس کے آنے کا مژدہ لے آئی — یہ ایسی بو صبا نے کس سے پائی
عجب کیا ہے جو بلبل کی فغاں سے — گرہ کھل جائے سوسن کی زباں سے
سبھی دستاں سرا کیا غنچہ کیا گل — اُوڑے میں باغ میں مانندِ بلبل
خزاں کی شام کیا صبحِ بہار ہے — کہ موجِ گل سے رنگیں خار خار ہے
عجب رنگیں بہار ہے یاسمن میں — گلِ خورشید پھولا ہے چمن میں
نہ لبریز ہے اگر مستی سے گلشن — جھکی جاوے ہے کیوں نرگس کی گردن
چمن کے کوچہ میں گر ہے سمن بو — عجب کیا آتا ہو ساقی گل رو
طراوت سے کہاں پرواز ممکن — کبوتر یا کہ باز ہو سب ہیں ساکن
پرِ مرغِ ہوا رنگیں ہوا آہ — مرا دل اب تلک سادہ رہا آہ
صبا کہہ بندگی پیرِ مغاں کو — دعا اس دُردکش کی مے کشاں کو

صبا ساقی سے جا میری دعا کہہ
خمار اس کا رقیبوں سے چھپا کہہ

تپ غم میں زباں کو لال کی ہے
لبوں پر مہر بُت خانہ نے دی ہے

مگر یہ مُہر ٹوٹے آہ دل سو
وگرنہ حرف کی طاقت ہے کس کو

شگافِ غم کرے ہے دل کو خاموش
کہ ہو ہے جام چینی مُو سے خاموش

جنوں آیا، خرد کی الوداع ہے
یہاں ہر لحظہ زور اختراع ہے

جنوں سے عقل کو کیوں کر نہ ہو رم
کہاں خورشید کا ہمدم ہو شبنم

کماں اے سینہ ریشِ ناخنِ غم
ترے زخموں پہ نہ پنبہ نہ مرہم

نکل مانندِ بوئے گل بدن سو
نسیمِ صبح سے مل جا چمن کو

یہ سرخی ہے تعریف بنگالہ میں
کہ خورشید واں داغ ہے لالہ میں

طلب ہے اگر تجھ کو واں جلد جا
کہ رہتے ہیں ہر دور میں اولیا

اگر دل میں ترے کچھ بھی طلب ہے
مگر درویشی کا پاس ادب ہے

تو چل بنگالہ کو میں بھی ہوں ہمراہ
دکھاؤں تجھ کو ملکِ عشق کا شاہ

کئی ہر عصر میں ہوتے ہیں کامل
کہ اکثر ہوتے ہیں عرفاں کے قابل

سبب یہ ہے کہ واں اکثر وفا ہے
محبت عجز اور صدق و صفا ہے

وفا سقفِ حریمِ راز سمجھو
یہ چار و چار دیوار اُس کی بوجھو

خصوصًا پنڈوہ حضرت صفی کا
وہاں ہے درس اسرارِ خفی کا

سبب یہ ہے کہ وہ فخرِ جہاں ہے
مکانِ سعدی و مہدی وہاں ہے

وہ شمعِ انجمن ہیں مصطفےٰ کے
جگر گوشہ ہیں وہ شیرِ خدا کے

جو کوئی سجدہ کرے اُس آستاں پہ
قدم اُس کا پڑے جا آسماں پر

وہاں حد کیا ارادہ کے اثر سے
ولے ہو جا دو عالم اک نظر سے

وہاں کے اہلِ علم ایسے ہیں فاضل
کہ ہیں ہر علم میں ہر ایک کامل

خصوصًا فنِ حکمت کا کمال ہے
ولے ہر شخص اہلِ وجد و حال ہے

کہاں یہ ذہن و جودت فلسفی کو
سمجھ سکتا ہے اسرارِ خفی کو

دوا کرتے ہیں واں دردِ طلب کے　　رکھو گر پاس مستوں کے ادب کے
طلب کے ساتھ گر پاسِ ادب ہو　　تو واصل حق کا بے رنج و تعب ہو
جو طالب پہنچے واں مطلوب ہو جائے　　محب گر جاوے واں محبوب ہو جائے
نلوں کے واں کو طورِ موسوی جان　　ہوا کو واں کے روحِ عیسوی جان
اگر گلخن ہے واں داغِ چمن ہے　　شرر کے لعل سے کانِ یمن ہے
وہاں کا دشت کیسا دلکشا ہے　　ہوائے معتدل کیا جاں فزا ہے
سنو مخدوم شرف الدین سے یہ حرف　　کرو ہمت کو اپنے اس طرف صرف
وصیت یہ کیا اپنے پسر کو　　تجلی بخشا اوس نورِ نظر کو
سیاحت جا کرو مشرق زمین کی　　تجلی دیکھو واں اہلِ یقیں کی
گذر ہے بیشتر صاحب دلوں کا　　وطن ہے بلکہ اکثر کاملوں کا
کمال اے خاک راہ رہبرِ عشق　　گدائے کوئے شہر بندرِ عشق
اگر بنگالہ تک جانا ہو مشکل　　عظیم آباد کو جا دیکھ کامل
شہر اسرار ہے عظیم آباد　　سرخی اوس کی بیاں ہے رکھ لے یاد
دیکھو جا کر وہاں کے کامل کو　　کیسے معمور ہیں وہ عرفاں کو
عجب شہر ہے عظیم آباد اے یار　　سراسر عشق سے ہے گرم بازار
تڑپتے ہیں ہر اک کوچہ میں بسمل　　نگاہِ دلبراں ہے تیغِ قاتل
خراماں ہر طرف سروِ گل اندام　　جدھر ہے قمری و بلبل کا ہے دام
تبسم زیرِ لب غنچہ دہن ہیں　　چمن آرا سبھی گل پیرہن ہیں
نزاکت سے قبا رنگیں ہے جیوں گل　　چمن سے آ اوڑے ہیں سر پہ بلبل
سواد اس کا ہے نورِ چشم جادو　　وہاں رم بھول جاویں چین کے آہو
مگر صحرا وہاں کا نافہ زار ہے　　ہوا اوس کی نسیم مشکبار ہے
زمیں کیسی شگفتہ ہو رہی ہے　　گویا فردوس کا گلشن یہی ہے
ستم کو دیکھ کر غنچہ دہن کا　　اوڑے ہیں رنگ جیوں بلبل چمن کا

ہر اک غنچہ دہن باغ وبہار ہے　　گویا منقارِ بلبل خار خار ہے
نہ تنہا جلوۂ محبوب دیکھو　　وہاں ہر کوچہ میں مجذوب دیکھو
عظیم آباد مستوں کا مکاں ہے　　محبت جیسی ہے واں وہ کہاں ہے
وہاں کے مست پر ہے رحم غالب　　وہاں پہنچاتا ہے مطلب کو طالب
اگرچہ مست بے نام ونشاں ہیں　　دلوں کے زخم پر مرہم فشاں ہیں
لبِ دریا کے جیہوں پر ہے آباد　　وہاں بالا بلند ہے سروِ آزاد
لطافت ساحلِ جیہوں کی کیا ہے　　طلسمِ گنجِ اسرارِ خدا ہے
تلاطم کو شکوہِ آسماں ہے　　کہ ادنیٰ موج اس کی کہکشاں ہے
وہاں کی کشتیاں ہیں چشم جادو　　شناور ہیں کہ یاد دریا میں آہو
وہاں سبزے کا رنگ آئینہ دار ہے　　زمرّد کی، زمیں الماس زار ہے
نہ جھاؤ سبز ساحل کے قریں ہے　　یہ سروستانِ فردوسِ بریں ہے
چلا ہے اک طرف واں بحرِ زخّار　　صدف اس کے گہر سے پُر ہے اے یار
عظیم الشان ہے اُس پار بھی شہر　　اسی باعث وہاں دریا ہے جیوں نہر
شراب صاف کا، لا جام ساقی　　رہے نہ کچھ کدورت اس میں باقی
کمال اے شورِ سیلِ دامنِ کوہ　　زیارت گاہِ ابرِ غم و اندوہ
تو بس کر اب سخن کیا قصّہ خواں ہے　　کسی کا اس طرف بھی گوشِ جاں ہے
یہ سرخی یقیں کے چمن زار کی　　اِسی گل سے بُو آتی ہے یار کی
یقیں گرچہ اوّل قدم ہے یہاں　　نہ پہنچا وے منزل کے تئیں کارواں
یقیں تخمِ خیالِ معرفت ہے　　ثمر اس کا کمالِ معرفت ہے
یقیں سے ہوئے ممکن جو محال ہے　　یقیں سے سرخوشی ہو جو ملال ہے
یقیں سے دل محیطِ آسماں ہے　　یقیں سے قطرہ بحرِ بیکراں ہے
یقیں وہ ہے گدا کو شاہ کردے　　چراغِ غولِ شمعِ راہ کردے
یقیں سے راہ زن بھی رہنما ہو　　بلا کے دشت میں خود پیشوا ہو

یقیں سے ہادیٔ کامل کو پہنچے / اگر رہ گم ہو تو منزل کو پہنچے
یقیں سے کوہ دم میں کاہ ہو جا / یقیں سے آسماں پر راہ ہو جا
یقیں سے ذرّہ خورشیدِ فلک ہو / یقیں سے مور کو بالِ ملک ہو
یقیں طوطی صفت بُت کو بلاوے / طعام اقسام کے اس کو کھلاوے
یقیں کے فیض کا گر شک ہے تجھ کو / سُنو تمثیل تسکیں بخش اِس سو
یہ ہے سرخیٔ اشکِ گل رنگ دیکھ / ہوا لعل اس چشم سے سنگ دیکھ
یہ گریہ سے برسے ہے بارانِ چشم / ہوئے جوش سے بحر عمّانِ چشم
چمن میں آکے ساقی یک تبسّم / کہ رنگینیٔ گُل، جیوں غنچہ ہو گم
کمال اے غرقِ سیلِ اشکِ خونیں / چمن یک قطرہ سے اس کے ہو رنگیں
یہ جامِ بیخودی ہے اشک کیا ہے / اسی نشّہ سے محفل کو صفا ہے
یہ اشک ہے دانۂ تسبیحِ آدم / اجابت ہو دُعا کی اس سو ہمدم
دُعا کے تیر کا پیکاں ہے یہ اشک / یہ ترکِ رخ لے جاوے ہے یہاں اشک
یہ قطرہ اشک کا طوفانِ نوح ہے / یہ مژگاں ساحلِ دریائے روح ہے
یہ باراں اشک کا دھووے سیاہی / بجھاوے آتشِ قہرِ الٰہی
گرہ میں اشک کی ہے بحرِ اعظم / اگرچہ ہے درِ نیسانِ ماتم
عجب سیلاب ہے یہ اشکِ حسرت / بہالے جائے تا دریائے وحدت
یہ موجِ اشک کے طوفاں کا زور ہے / اسی سیلاب سے دریا کا شور ہے
نوازش حق کی اس گریہ سے ہو ہے / نہ پہنچا اس سے مطلب کو وہ کو ہے
نہ تنہا اشک سے صحرا ہے سرسبز / اسی باراں سے ہے باغِ وفا سبز
یہ اشکِ گرم کو تخمِ شرر ہے / نہالِ درد کا آخر ثمر ہے
چمن آرائے باغِ دل ہے یہ اشک / گلِ فردوس کو سوداغ ہے اشک
یہ ہے سرخیٔ آہِ اخگر فشاں / یہ گل داغ سینہ کو دے ہے نشاں
غنیمت سمجھ ملنا اس مرد کا / اثر جس کے نالہ میں ہو درد کا

کہاں اے سوزِ غم سے سینہ بریاں
گدازِ دل سے ہر دم چشم گریاں

نہ رہ خاموش ہر دم آہ بھر آہ
جو رہ گم ہو وہی ہو جادۂ راہ

اگر رہ گم ہو تو مانندِ جرس تو
فغاں کر پہنچے شاید راہ بر کو

یہی فریاد، خود فریاد رس ہے
یہی اس رہ میں مضمونِ جرس ہے

اگر فریاد سے غافل ہو مظلوم
تو اس کے درد کو کم پہنچے معلوم

یہ نالہ کیا ہے سوز و سازِ عشق ہے
کلیدِ قفلِ گنجِ رازِ عشق ہے

قیامت سوز ہے آہِ جگر میں
کئی دوزخ گرہ ہے یاں شرر میں

یہ سوزِ نالۂ جاں سوز سن کر
جلے سینہ جہنّم کا سراسر

یہ سوزِ سینہ کی دیکھو کرامت
جلو میں آہ کے ہے صد قیامت

نسیمِ نالہ پیکِ نامہ بر ہے
کبوترِ دل کا گو بے بال و پر ہے

سمندِ نالہ کے جولاں گری کو
نہ پہنچے برق گر نکلے بدن سو

نہ تارِ نالہ کو سمجھا کہ کیا ہے
کمندِ بامِ عرشِ کبریا ہے

کرے معشوق کو بے تاب یہ آہ
اسی کوچہ سے دل تک سب کے ہے راہ

یہ دودِ آہ لبریزِ شرر ہے
نہالِ عشق کو آخر ثمر ہے

گرہ ہو دل میں آہِ ناتواں جب
فزوں دوزخ سے ہو سوزِ دروں تب

اثر کیوں نغمۂ داؤد میں تھا
وہاں نالہ تھا پردے میں سمجھ جا

یہ نالہ سنبلِ باغِ جنوں ہے
سمن سے اس کے بو دل کش فزوں ہے

کرے مقبولِ حق یہ آہ و زاری
یہی مرہم ہو گر ہو زخم کاری

نہ رہ چاہِ طبیعت میں تو ہے ہے
نکل یہ آہ کیا حبل المتیں ہے

اگر اس راہ میں گم ہو جرس سو
کہاں پروا ترے فریاد رس کو

جگر اس نالہ سے دو لخت ہو
اگرچہ سنگِ خارا سے بھی سخت ہو

یہ نالہ سے گرہ کھل گئی زباں کی
کہاں تھی اس کے تئیں طاقت بیاں کی

پلا چشمِ سیہ سے ساقی اک جام
سیہ مستی سے صبحِ حشر ہو شام

کہاں اے کوہِ سنگِ دردِ جانکاہ — بلند ہر لحظہ دل سے شعلۂ آہ
یہ سوزِ درد کب رونے سے جاوے — کب آتش سنگ کی پانی بجھاوے
کہاں بے درد دیدہ خوں فشاں ہو — کہ جڑ سے کوہ کی چشمہ رواں ہو
یہ سنگِ درد کی کس دل کو تاب ہے
شررکا خس کے پرتو آفتاب ہے





HAZRAT KAMAAL
(Rahmatullah Alaih)

Hayaat aur Sha'iri

by
Dr. Shah Hasan Usmani

Published by:
Majlis Musannifeen-e-Islami
Baitur Rashad
Shanti Bagh, New Kareemganj,
Gaya-823001

Price Rs.: 100.00